سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست نمبر

صورت گرانِ دکن

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد

میں

مطبوعہ نگارشات کا انتخاب

ناشر

روزنامہ سیاست
جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

سنہ اشاعت	ــــ	مئی ۱۹۷۹ء
تعداد	ــــ	ایک ہزار
قیمت	ــــ	۷ روپے
مطبوعہ	ــــ	سیاست آفسٹ پریس

ناشر

روزنامہ سیاست - پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷

جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

ملنے کے پتے :

روزنامہ سیاست جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد

حسامی بک ڈپو، چارکمان حیدرآباد

مادرِ جامعۂ عثمانیہ

کے نام

جس نے صحافتی زندگی کا شعور عطا کیا

فہرست

تعارف

اِدارۂ سیاست کی یہ چوتھی پیشکش "صورت گرانِ دکن" ان روشن چہروں کو پیش کرتی ہے جن کے نام ہمارے دلوں کی پہنائیوں میں گونجتے رہے ہیں۔ کچھ چہرے سب کے دیکھے بھالے ہیں ــــ اور کچھ ایسے جن کے بارے میں نئی نسل ناواقف ہے ــــ ایک آدمی کی بساط ہی کتنی ــــ سو برس بھی جئے تو ایک دن اس عالم رنگ و بُو کو چھوڑ جانا برحق! لیکن تاریخ کے ریگزار میں کچھ لوگوں کے چھوڑے ہوئے نقوشِ پا ہمیشہ تازہ نظر آتے ہیں۔ امتداد وقت و زمانہ کی گرد ان پر جمنے نہیں پاتی ؎

چھیڑے تو کوئی ہم پھوٹ بہیں، کیا کس کی سُنیں، کیا کس سے کہیں
آنکھوں کے کھنڈر سے کیا پوچھیں، ٹھہرا ہے یہ دریا کس کے لئے

یہ قلمی چہرے "سیاست" کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یادوں کی صورت میں۔! خراجِ تحسین و عقیدت کی شکل میں! ــــ حیدرآباد، سالہا سال تک جاگیرداری نظام کا آئینہ دار رہا اور اسی گروہ جاگیرداران سے بہادر یار جنگ اُٹھے، اتحاد المسلمین کے بانی! ــــ مگر مہاراجہ کشن پرشاد کو "چاچا" کہہ کر آداب بجا لاتے! کبھی مہاراجہ کا ٹیلیفون آتا تو اسے اتنی تعظیم و تکریم کے ساتھ وصول کرتے جیسے کوئی بزرگ خاندان سامنے کھڑا ہے۔ اکثر مادر ناتھے، راجہ رائے رایان تھے ــــ اپنے وقت کے مُسلم والئی ریاست کے ایسے وفادار کہ بڑی سے بڑی آزمائش بھی ہنستے ہنستے قبول کر لیتے۔ عوام میں ہندو، مُسلم، سکھ، عیسائی کا کوئی بھید بھاؤ

نہ تھا۔ دانشوروں کا یہ عالم کہ "یا مسلماں اللہ اللہ، یا برہمن رام رام" "آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا" ۔ کہتے ہیں، ہمارے شہر کو صوفی سنتوں اور خدا ترسوں کی دامن بھر دعائیں ملی ہیں شاید انھیں دعاؤں کا اثر تھا کہ اس شہر نے سروجنی نائیڈو، بہادر یار جنگ، علی نواز جنگ اور وینکٹ راما ریڈی، جیسے اڈمنسٹریٹر اور مہاراجہ اور سر اکبر حیدری جیسے وزرائے اعظم اور نہ جانے ایسے کتنی ہی شخصیتوں کو جنم دیا، جن کے جسم خاکی تو کبھی کے پیوندِ زمین ہو گئے لیکن جن کے نام آج بھی شرافت و محبت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہ انھیں میں سے چند ایک کے قلمی چہرے ہیں۔ ذرا اس آئینہ میں جھانک کر دیکھئے اور سوچئے کہ ان کے کردار کے کتنے پھول ہم چن سکتے ہیں۔

یہ وہ شخصیتیں تھیں جنھوں نے حیدرآباد کی تاریخ بنائی، ان میں سے ہر ایک پر ایک بسوط اور ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں تو، ان شخصیتوں کے چند نقوش ابھارے جا سکے ہیں۔ وہ باتیں جو، خلوتِ دل میں ایک ہلچل سی مچا دیتی ہیں اور خود ہمارے اندر کا آدمی ہم سے پوچھتا ہے ۔ "دراصل یہی شخصیتیں تو شہرِ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا تانا بانا تھیں ۔" اور انھیں کی درازقدی نے حیدرآباد کو بھی سرفراز و سربلند کیا۔ اس کی تعمیر میں ان کی فکرِ رسا اور ان کے دماغ کا بڑا دخل رہا ہے۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ مشاہیرِ دکن پر قلم اٹھانے والے بھی اپنے وقت کے جید قلمکار اور دانشور رہے ہیں۔ اس فہرست میں آغا حیدر حسن اور پنڈت ونشی دھر بھی ہیں اور صالحہ عابد حسین بھی ہیں جن کی تحریریں ادب کا ایک اعلیٰ حصّہ ہیں۔

ویسے تو ان مشاہیر کے حالات کو یکجا کر کے کتابی شکل دینے کا کام بہت پہلے ہی تکمیل پا جانا چاہیئے تھا۔ مگر دیر ہی سے سہی، یہ مختصر سی کتاب، ایک دیرینہ خواب کی تعبیر کا نقطۂ آغاز تو بن سکتی ہے

عابد علی خاں
ایڈیٹر سیاست

روزنامہ "سیاست"
جواہر لال نہرو روڈ
۲۵- اپریل ۱۹۷۹ء
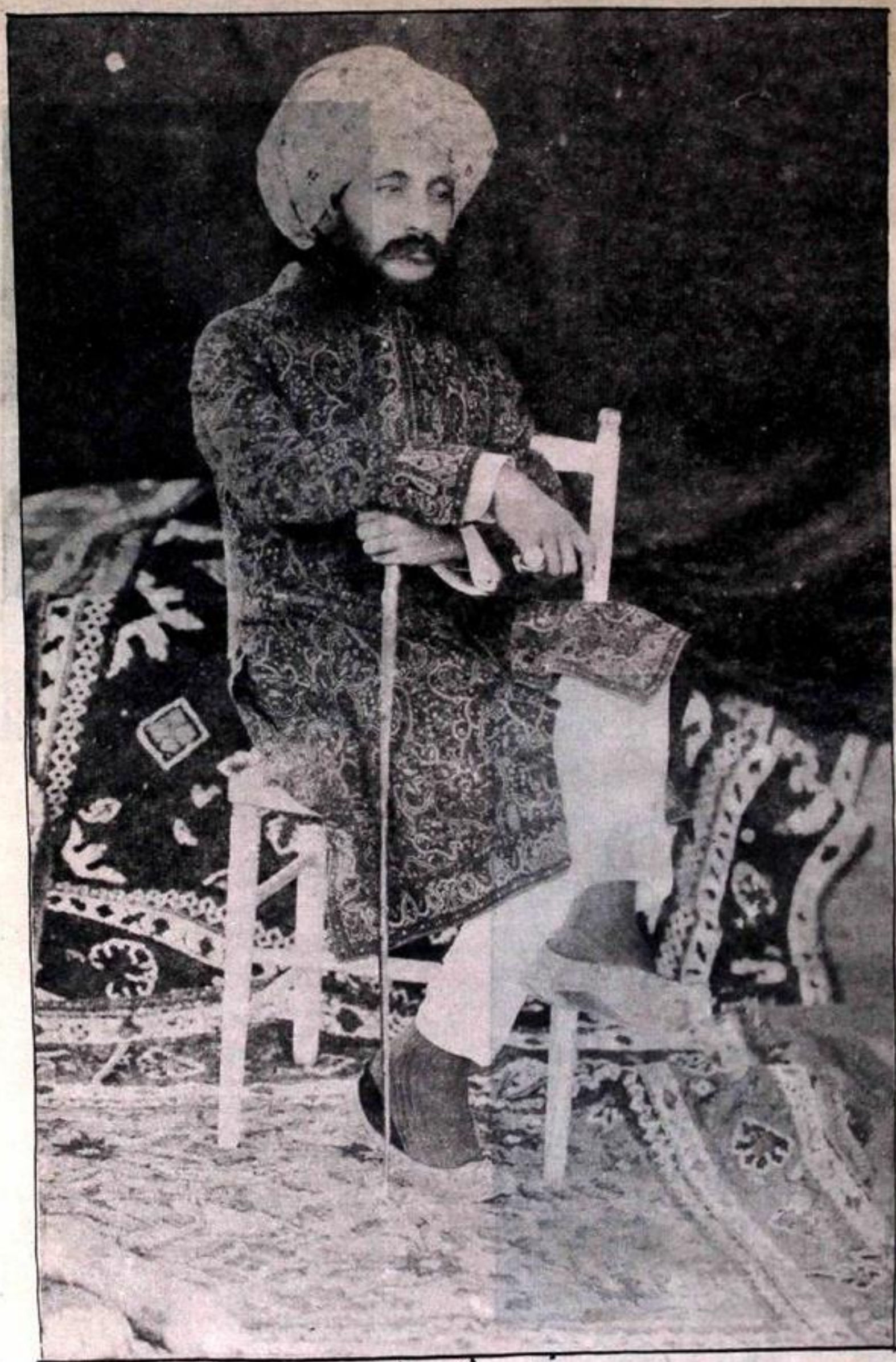
نواب میر محبوب علی خان

نواب میر عثمان علی خاں

مہاراجہ کشن پرشاد

ماہ لقا بائی چندا

مبارز الدولہ

موسیو ریمون

مصور جنگ راجہ دین دیال

نواب سر سالار جنگ بہادر

نواب علی نواز جنگ بہادر

نواب بہادر یار جنگ

نواب سر امین جنگ

نواب مہدی نواز جنگ

سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ

وینکٹ راما ریڈی
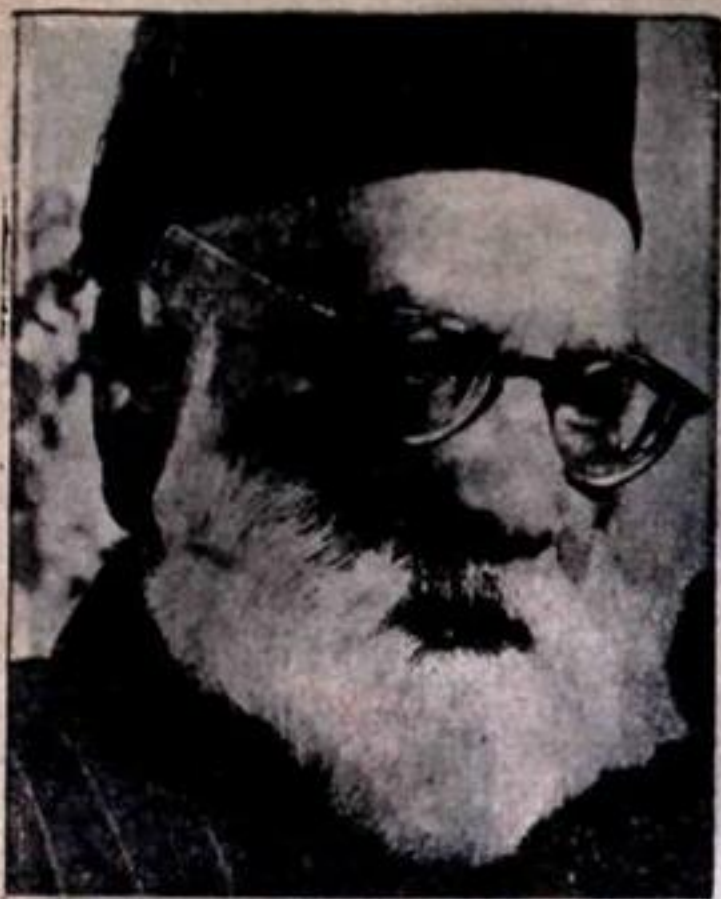
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ڈاکٹر عبدالحق

سروجنی نائیڈو

نصیر الدین ہاشمی

ملکہ حیات بخشی بیگم

تاریخ کے صفحات پر کئی شہزادیوں کے نام اُن کے زرین کارناموں کی وجہ سے تاباں اور درخشاں ہیں۔ اُن میں سے ایک ملکہ حیات بخشی بیگم بھی ہے۔ یہ وہ خوش قسمت اور اور خوش نصیب ملکہ تھی جو سلطان محمد قلی کی نورِ نظر، سلطان محمد قطب شاہ کی ملکہ دلنواز اور سلطان عبداللہ کی مادر مشفقہ ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ حیات بخشی بیگم نے اپنے تدبّر و سیاست، عقلمندی اور فراست کے ساتھ ساتھ رفاہِ عام کے کاموں کے لحاظ سے بھی زندگیٔ جاوید حاصل کرلی ہے۔ حیات نگر کی آبادی، وہاں کی جامع مسجد اور اس کے ساتھ سوا سو طلباءؑ کے دار الاقامہ کی تعمیر اور اس کے علاوہ دیگر رفاہی کاموں کی وجہ سے اس کا نیک نام تاریخِ دکن سے مٹ سکتا ہے اور نہ حوادث زمانہ اس کو محو کر سکتے ہیں۔

شادی

بادشاہوں اور ان کی اولاد کی شادیاں اکثر سیاسی غرض کے تحت ہوا کرتی ہیں دکن کی اسلامی سلطنتوں میں بھی اسی پر خصوصیت سے عمل ہوا۔ گولکنڈہ کی دو شہزادیاں سیاسی اغراض اور سلطنتوں کے مفاد کے تحت سلاطین بیجاپور سے بیاہی گئیں، احمد نگر کی شہزادی بھی بیجاپور کی ملکہ بنی تھی۔ حیات بخشی بیگم سلطان محمد قلی کی اکلوتی دُختر تھی۔ حیات بخشی بیگم اپنے حسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھی اور دُور دُور تک اس کا شہرہ تھا۔ اس کی شادی سے نہ صرف سیاسی اغراض کی تکمیل ہو سکتی تھی بلکہ ایک خوبصورت دلہن بھی دستیاب ہو سکتی

تھی بلکہ اِسی وجہ سے ایران کے بادشاہ عباس صفوی نے اپنے لڑکے کے لئے پیغام دیا تھا اور یہ خواستگاری اس وقت ہوئی تھی جبکہ ہنوز شہزادی کی عمر نو' دس سال کی تھی۔

اگر ہم فرشتہ کے اس بیان کو تسلیم کریں کہ سلطان محمد قلی نے شاہ عباس کے پیغام کو منظور کر لیا تھا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حیات بخشی بیگم کی شادی سلطان محمد سے کس طرح ہوئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاہِ ایران کے پیغام کا کوئی جواب باثواب سلطان محمد قلی نے نہیں دیا تھا۔ ایرانی سفیر کو امید تھی کہ سلطان محمد قلی اس پیغام کو قبول کرلے گا۔ مگر امراء دربار گولکنڈہ خصوصاً علامہ میر محمد مومن کی وجہ سے اس مسئلہ کا تصفیہ نہایت خوبصورتی سے طے ہوگیا۔

واضح ہو کہ سلطان محمد قلی کو کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اور اس نے اپنے بھتیجے محمد کی پرورش مثل اپنے بچوں کے فرمائی تھی۔ میر محمد مومن سے شہزادہ محمد کو بڑا خلوص تھا اور میر صاحب کا اعزاز سلطان محمد قلی کے دربار میں بہت زیادہ تھا۔ میر صاحب نے اس امر کی کوشش کی کہ شہزادہ محمد کی شادی حیات بخشی بیگم سے ہوجائے۔ چنانچہ ہنوز ایرانی سفیر گولکنڈہ ہی میں مقیم تھا کہ شہزادہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔

شادی کے بعد بیٹی اور داماد کے رہنے کے لئے ایک عظیم الشان محل کو پہلے ہی آراستہ و پیراستہ کرالیا تھا چنانچہ جلوہ کے بعد اس شاہی برات کو اسی محل میں بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اتارا گیا۔ افسوس ہے کہ مورخ نے اس محل کا نام نہیں لکھا لیکن ہمارے خیال میں یہ محل دولت خانہ عالی کی جانب جنوب اس جگہ بنایا گیا تھا جہاں اب محلہ "مٹی کا شیر" اور قدیم قطب شاہی مسجد واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد حیات بخشی بیگم کے محل میں واقع تھی اور جہاں اب ایام عاشورہ میں مٹی کا شیر اور تعزیہ بٹھایا جاتا ہے۔

حیات بخشی بیگم کی اولاد

حیات بخشی بیگم کی شادی ۱۰۱۶ھ میں ہوئی۔ سات سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی اس کے بعد دو لڑکے، ایک لڑکی اس کے ثمرہ حیات بنے۔ پہلا لڑکا عبداللہ ہے جو ۱۰۲۳ھ میں تولد ہوا جبکہ اس کے نانا سلطان محمد قلی کا انتقال ہو چکا تھا اور سلطان محمد سریر آرائے حکومت تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ نومولود شہزادہ کے تولد کی پوری خوشی منائی جاتی اور دھوم دھام سے جشن ہوتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ نجومیوں نے خبر دی تھی کہ شہزادہ کو بارہ سال تک باپ سے دور رکھا جائے اس لئے زیادہ اہتمام اور کروفر نہیں ہوا۔ صرف ایک ہفتہ تک جشن ہوتے رہے اور امرائے دولت اور داعیان ملک کو حسب مراتب انعامات عطا ہوئے۔ شعراء نے تاریخیں کہیں۔ میر محمد مومن نے "کام بخش جہاں" سے تاریخ نکالی۔ شہزادہ کی پرورش میر قطب الدین نعمت اللہ کے ذمہ کی گئی۔ اور تربیت کے لئے انہی کا تقرر ہوا۔

اس کے دو سال کے بعد ۱۰۲۹ھ میں دوسرا لڑکا شہزادہ علی مرزا کی ولادت ہوئی۔ اس شہزادہ کی ولادت کی بہت زیادہ خوشی منائی گئی اور تمام قلمرو گولکنڈہ میں شادیانے بجے، عام خلائق کو مالا مال کر دیا گیا۔

حیات بخشی بیگم بحیثیت ملکہ

حیات بخشی بیگم کی شادی کے تقریباً چار سال بعد ۱۰۲۰ھ میں سلطان محمد مسند نشین ہوا اور ۱۰۳۵ھ میں اس کا انتقال ہوا اس طرح پندرہ سال تک حیات بخشی بیگم گولکنڈہ کی ملکہ بنی رہیں۔

سلطان محمد کے عہدِ حکومت میں گولکنڈہ کی سلطنت پورے عروج پر تھی۔ اس کا زمانہ نہایت امن و امان اور سکون و اطمینان کا رہا، نہ تو سلطنت کے اندر کوئی جھگڑا یا فساد ہوا اور نہ ہی کسی بیرونی دشمن اور ہمسایہ ممالک سے جنگ کی نوبت آئی

بہرحال اس کا زمانہ حکومت ہر قسم کے تلاطم اور شورش سے مامون رہا۔

سلطان محمد نہایت پاکیزہ اخلاق اور مذہب پرست، صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند تھا۔ مکہ مسجد کی بنیاد رکھتے وقت اس کے تقویٰ کی پوری آزمائش ہوگئی تھی۔ ملک کے باہر کی جنگیں اور اندرونی فساد اور جھگڑے نہ ہونے کے باعث سلطان محمد کو اس امر کا پورا موقع ملا تھا کہ اندرونِ ملک اصلاحیں کرے۔ زراعت کو ترقی دے۔ صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے سامان کئے۔ نئے نئے قصبات آباد کئے۔ کئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ حیات بخشی بیگم ان تمام کاموں میں اپنے نامور شوہر اور مذہب پرست سلطان کی پوری مشیر اور صلاح کار بنی رہیں۔ وہ اپنے شوہر کو صلاح ومشورہ دیتی تھیں چنانچہ اس کے ثبوت میں خافی خاں کے الفاظ پیش کئے جاسکتے ہیں جو اس کی بخوبی تصدیق کرتے ہیں۔

"والدہ عبداللہ قطب شاہ کہ در کل امور ملکی ومالی دخیل مستقل گردیدہ بود"

اس صراحت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حیات بخشی بیگم اپنے شوہر کے زمانہ میں صلاح ومشورہ کی حد تک دخیل تھی۔ زمانہ مابعد میں اس نے جس طرح انتظام سلطنت میں حصہ لیا اس سے بھی یہ امر پایۂ تصدیق کو پہونچتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے ان کاموں کے لئے تیار تھی۔

سلطان محمد کا انتقال اس کی جوانی میں ہوگیا۔ سلطان کے مرنے کے بعد اس کا فرزند عبداللہ مسندِ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اس زمانے میں عبداللہ کا بچپن تھا۔ ۱۰۲۳ھ میں اس کی ولادت ہوئی تھی اور ۱۰۳۵ھ میں جبکہ اس کی عمر صرف بارہ سال تھی ایک بڑی حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آگئی لیکن ظاہر تھا کہ ایک کم سن لڑکا مہمات سلطنت انجام نہیں دے سکتا اس لئے اس کی ماں حیات بخشی بیگم اور دادی آغا خانم نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انھوں نے منصور خاں حبشی، ملک الماس، ملک یوسف کو شامل کرکے

ایک کونسل ترتیب دی۔ اس مجلس کی روحِ رواں ملکہ حیات بخشی بیگم تھی۔ تمام سیاسی اور انتظامی امور اس کے مشورہ سے طے ہوا کرتے تھے۔

عبداللہ قطب شاہ کے ابتدائی دورِ حکومت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ حیات بخشی بیگم نہایت دانائی اور تدبیر سے حکومت کرتی رہی۔ نظم و نسق کے لئے قابل اشخاص کا انتخاب ہوا۔ چنانچہ اولاً شاہ محمد کو جو سلطان عبداللہ کا پھوپھا تھا اور خانم آغا کا داماد تھا پیشوا مقرر کیا گیا۔ مگر اس بڑے عہدے کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ اس لئے شیخ محمد ابن خاتون کو ایران کی سفارت سے واپس آنے پر نائب پیشوا بنایا گیا حیات شیخ کو دبیر کی خدمت عطا کی گئی۔ منصور خاں حبشی میر جملہ بنایا گیا۔ قاسم بیگ کوتوال اور حسن بیگ نائب کوتوال مقرر ہوئے۔ میر قاسم کو ناظر الممالک اور خواجہ احمد ترک سرخیل کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اعتماد راؤ ہندی خزانہ کے لئے، نارائن راؤ مجموعہ داری کی خدمت پر اور سرور راؤ شرع نویسی کی خدمات پر مامور کئے گئے لیکن جب ان میں سے بعض اشخاص نااہل ثابت ہوئے تو ان میں رد و بدل کیا گیا اور شیخ احمد ابن خاتون مستقل طور پر پیشوا مقرر کئے گئے۔ انھوں نے قابل ترین اشخاص کو بڑے خدمات پر مامور کیا۔

اس میں شک نہیں کہ جب تک سلطان عبداللہ جوان ہو کر سلطنت کے کاروبار پر پوری طرح حادی نہیں ہو گیا۔ حیات بخشی بیگم نے نہایت فراست اور دانشمندی کے ساتھ گولکنڈہ کی حکومت کا شیرازہ پراگندہ اور منتشر ہونے نہیں دیا اور فہم و فراست سے حکمرانی کرتی رہی مگر جب سلطان عبداللہ نے اپنے سن و شعور کو پہونچ کر خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو اس سے وہ قابلیت ظاہر نہیں ہوئی جو اس کے پیشرو سلاطین میں موجود تھی۔ اس میں سیاسی تدبر اور بیدار مغزی کے جوہر مفقود تھے۔ وہ عیش و عشرت اور رقص و طرب کا دلدادہ تھا اس کی عمر کا بڑا حصہ لہو و لعب میں گذرا۔ سلطنت کے کاروبار اور اس کی دیکھ بھال سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وجہ سے حکومت پر زوال آگیا اور مغلوں کے حملے شروع ہو گئے۔

مغلوں سے جب ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی اور بالآخر صلح ہوئی تو اس میں بھی حیات بخشی بیگم کا بڑا حصہ تھا جس کی صراحت ہم آگے کریں گے۔ یہاں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ابتدائی عہد کے دو واقعات جو تاریخ دکن میں خصوصیت سے لکھے گئے ہیں، ان کی صراحت نامناسب نہیں ہے۔

لنگر کی بناء

جو اصحاب آج سے تیس چالیس سال قبل کے واقعات سے واقف ہیں وہ "لنگر" کو نہ بھولے ہونگے۔ مگر موجودہ نسل، شاید اس "لنگر" کی جب تک تفصیل بیان نہ کی جائے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتی اس لئے یہاں تفصیل کے ساتھ "لنگر" کی صراحت کی جاتی ہے

مصنف گلزار آصفی لکھتا ہے کہ ۲۷ ذی الحجہ کو سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے شاہی ہاتھی "مورت" نام پر سوار ہو کر حیدرآباد سے گولکنڈہ جا رہا تھا موسیٰ ندی چڑھی ہوئی تھی اور پانی ایک مہیب شور کے ساتھ بہہ رہا تھا، ہاتھی جوشِ تلاطم کو دیکھ کر مست ہو گیا۔ مہادت کو ہلاک کر کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ ہاتھی سے اتر جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ناچار اس پر سوار رہا اور جدھر ہاتھی چاہا، جاتا رہا۔ جب یہ خبر سلطان کی والدہ حیات بخشی بیگم کو معلوم ہوئی تو اس نے حکم دیدیا کہ جنگل کے درختوں پر کھانا اور پانی باندھا جائے تاکہ ہاتھی جس درخت کے نیچے ٹھہرے سلطان کو غذا میسر آسکے۔ آخر ذی الحجہ تک یہی حالت رہی محرم کا چاند دیکھ کر حیات بخشی بیگم نے منت مانی کہ اگر سلطان صحیح سلامت واپس آجائے تو چالیس من سونے کی زنجیر بنا کر حسینی علم پر لے جائے گی وہاں وہ خیرات کی جائے گی اس منت کے بعد ہاتھی کی مستی غائب ہو گئی اور وہ سلطان کے حکم کے مطابق گولکنڈہ آگیا۔ حیات بخشی بیگم اپنی منت کے موافق سونے کی زنجیر بنوائی اور سلطان کی کمر میں باندھ کر گولکنڈہ سے حسینی علم تک پا پیادہ روانہ کیا اور یہاں وہ طلائی زنجیر کا سونا غرباء اور مساکین کو تقسیم کیا گیا اور ہر سال یہ رسم جاری رہی۔

حیات بخشی بیگم کی یادگاریں

تاریخ گلزار آصفی کے مصنف نے حیات بخشی بیگم کی تعمیری سلسلہ میں جن رفاہی کاموں کا تذکرہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آبادی قصبۂ حیات نگر

۲۔ مسجد مدرسۂ حیات نگر

۳۔ تالاب ماں صاحبہ

۴۔ مسجد قطب عالم متصل فتح دروازہ

۵۔ مسجد واقع دولت خانہ عالی

۶۔ علم نعل صاحب

اس کے علاوہ کنویں، کارواں سرا، وغیرہ تعمیر کرنے کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔

۴ر جولائی ۱۹۵۴ء

مسٹر ڈبلیو تھیولا نوش

موسیو ریمون

حیدرآبادی جسے موسیٰ رام کہتے تھے

نوواردانِ شہر جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے۔ آندھرا پردیش کی نئی راجدھانی کے بعض مخصوص مقامی ناموں کے تعلق سے متجسس ہیں اور قدرتی طور پر اس قدیم شہر کے بعض مقامات کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں مثلاً یہ کہ اس گنجان آبادی والے ٹیک کو جہاں سینٹ جوزف کا کلیسا ہے توپ کا سانچہ کیوں کہتے ہیں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ اس مقام پر توپ سازی کا کارخانہ رہ چکا ہے۔ اور جس کے باقیات اب بھی بطور تاریخی یادگار محفوظ کئے گئے ہیں۔ اس سوال کے بعد بھی اور سوالات اُٹھتے ہیں۔ یہ توپ کا سانچہ کس نے بنایا اور کس کیلئے توپ سازی ہوا کرتی تھی؟ یہ سوالات اس دور کو یاد دلاتے ہیں جب کہ قدیم حیدرآباد میں فرانسیسی اثرات مسلط تھے۔ اس کی تفصیل سے تاریخ کے ایک رنگین باب پر روشنی پڑتی ہے۔

نظام کے اقتدار کے پیچھے جس فرانسیسی باشندے کا اثر تقریباً بیس سال تک کارفرما رہا ہے اس کا نام موسیو فرانکو ریمن تھا۔ یہ اپنے وقت کا ایک منچلا سپاہی تھا۔ معتبر تاریخی شہادت یہ بتلاتی ہے کہ وہ اپنے دور میں نہ صرف حیدرآباد، بلکہ ہندوستان کے لئے ایک ایسی ہستی تھی جس کی شخصیت میں سیاسی اقتدار مرکوز تھا اپنے اثر ورسوخ کی بناء پر نظام کی مملکت میں ایک بادشاہ گر کی حیثیت کا حامل تھا۔ اس کا یہ موقف برٹش مفاد کے لئے ایک خطرہ بنا ہوا تھا۔ نظام علی خاں ثانی اس

شخص سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی ایک پسندیدہ قسم " موسیٰ رحیم کے سر کی قسم " بھی تھی۔ عام طور پر موسی ریمو کو حیدرآباد میں موسیٰ رحیم ہی کہا جاتا تھا۔

بعض مورخین نے ریمو کو ایک حوصلہ مند اور چالباز شخص کے نام سے یاد کیا ہے۔ جو اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے بے حد دل پسند عادات و اطوار کو کام میں لاتا تھا۔ اور بعض نے اسے ایک بہادر، نڈر، قابلِ اعتماد اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیت کا مالک قرار دیا ہے۔ اور بلاشبہ ریمو ان تمام غیر ملکی مہم پسند، اور بخت آور سپاہیوں میں سب سے زیادہ غیر معمولی صلاحیت کا شخص تھا۔ جو ہندستانی ریاستوں کی سیاست میں دخیل تھے۔ ہندستانی تاریخ میں اٹھارویں صدی ایک انتہائی کرب دبے چینی کا دوَر رہا ہے۔ کسی مورخ نے یہ صحیح کہا ہے کہ " تاریخ صفحات پر نہیں، بلکہ خون میں لکھی جاتی تھی "۔ یہ صحیح ہے کہ ریمو سے قبل کوئی غیر ملکی مہم پسند سپاہی نے طاقت و اقتدار کی اس بلندی تک رسائی حاصل نہیں کی تھی جتنی کہ ریمو نے اپنی عمر کے صرف ۴۳ سال میں حاصل کی تھی۔ یہ پہلا شخص تھا جو پورے جنوبی ہند اور خاص کر حیدرآباد میں اس قدر بارسوخ و مقتدر حیثیت کا مالک تھا۔ نیز یہ کہ حیدرآباد کے قدیم خاندان اور ریمو کے زیر کمان فوجیوں کی اولاد آج دو سو سال کے بعد بھی ان روایات و واقعات کی یاد اپنے دلوں میں تازہ رکھتی ہے۔ بلاشبہ سرزمینِ فرانس کا یہ سچا اور دلیر سپوت۔ جو ہندوستان کو اپنا وطن بنا چکا تھا اپنے آپ کو پوری طرح ہندوستانیوں کا ہمنوا بنا لیا تھا۔

ریمو ۱۷۵۵ء میں بمقام سری ناگ (فرانس) پیدا ہوا، بمشکل بیس سال کا تھا کہ اپنے باپ کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے پانڈیچری پہنچا۔ لیکن اس دوَر کی روایت کے مطابق دوسرے یوروپی باشندوں کی طرح اس نے بھی بہت جلد اپنے ہاتھ سے قلم چھوڑ کر تلوار تھام لی۔ اپنے چند مہم پسند ساتھیوں کے ساتھ

وہ میسور چلا گیا۔ اور حیدر علی کی ملازمت میں منسلک ہو گیا۔ کیوبلیر لا میے کے تحت انگریزوں کے خلاف ۱۷۸۰ء میں ایک سب لفٹنٹ کی حیثیت سے جنگ میں شریک رہا۔ حیدر علی کے انتقال کے بعد ریمو مشہور جنرل بسے کی فرانسیسی فوج میں کپتان کے عہدہ پر فائز رہا۔ اور بالآخر اس کا اے ڈی سی بنایا گیا۔ پانڈیچری میں بسے کی موت تک ۱۷۸۵ء اسی عہدہ پر مامور رہا۔ نواب صلابت جنگ کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے.....

اس نے نظام کی راجدھانی کا رُخ کیا کیونکہ نظام الملک کے لڑکوں میں صلابت جنگ کو فرانسیسیوں کی حمایت کی وجہ سے تخت حاصل ہو سکا تھا۔ لیکن انگریزوں نے بعد میں نظام علی خاں کو تخت پر بٹھایا۔ اس تبدیلی کے باوجود ریمو ۱۷۸۶ء میں نظام علیخاں کی ملازمت میں منسلک ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور تیرہ سال یعنی اپنی موت تک نظام اور انکی رعایا کے کاروبار میں سیاہ وسپید کا مالک بنایا۔ مارچ ۱۷۹۸ء میں اس کی اچانک موت کی وجہ آج تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔

نظام کے دربار میں اپنا اثر و رسوخ اتنا بڑھا چکا تھا کہ وہ نظام کا دست راست بن گیا تھا۔ اس نے سب سے پہلا کام جو انجام دیا ہے وہ دیسی فوج کی بڑی تعداد کو یوروپی طرز پر تربیت دی تھی اور پہلے سے جو یوروپین ملازم تھے انکی کمان میں یہ فوج دیدی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ساحل کے قریب ایک فرانسیسی تاجر سے وہ ماہانہ آٹھ آنہ کرایہ پر فوجی مسکٹ حاصل کرتا رہا۔ جب ۱۷۹۰ء میں ٹیپو کے خلاف لڑائی شروع ہوئی، تو اس نے صرف سات سو سپاہیوں کے ساتھ اس جنگ میں شرکت کی اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس امتیازی کارنامہ کی بناء پر نظام نے اس کی فوج کی تعداد کو پانچہزار تک بڑھانے کا حکم دیا اور اس کی ماہوار بھی پانچہزار کر دی گئی۔ اس کی یہ ترقی رفتہ رفتہ بڑھتی ہی گئی۔ اور ۱۷۹۵ء میں اس کی کمان میں پندرہ ہزار تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے۔ جن پر ۱۲۴ یوروپین آفیسر مقرر تھے۔ اس

فوج میں ایک طاقتور توپ خانہ بھی شامل تھا۔ جن کے حمل و نقل کے لئے پانچ ہزار بیل استعمال ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سوارہ دستہ بھی تھا۔ جس کی تعداد چھ سو تھی۔ اس کے توپ سازی کے کارخانے میں اچھی توپ اور مسکٹ ڈھالی جاتی تھیں اس کام کے لئے قابل یوروپین متعین تھے۔

آخری لڑائی جس میں ریمو نے حصہ لیا۔ وہ کھرڈلا کی جنگ تھی۔ اس جنگ میں اس کا حریف میدان بھی اس کا ہم وطن پیرون تھا۔ جو مرہٹہ فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ اس لڑائی میں نظام کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ معتبر تاریخی شہادت سے یہ ظاہر ہے کہ اس شکست کا ریمو ذمہ دار نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت گھمسان کا رن پڑا اور اپنے حریف فرانسیسی جنرل کے خلاف اس کا پلہ بھاری ہو چلا تھا۔ نظام کے مسلسل اصرار پر فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور یہ اقدام حیدرآباد کی فوجوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوا جیسا کہ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ :۔ "مشرقی روایت کے مطابق ضعیف العمر نظام نے اپنا پورا اعتماد، سوارہ فوج پر چھوڑ رکھا تھا۔ اور جب سوارہ فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ تو وہ خوفزدہ ہو کر پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔ ایسے وقت میں ریمو کے سپاہی کو سوائے حفاظتی کارروائی کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے اور بادل ناخواستہ شکست اٹھانی پڑی۔" اس کے برخلاف ریمو کو اگر مجبور نہ کیا جاتا تو ممکن ہے نظام کی شکست کامیابی میں بدل جاتی۔

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ نظام خود اس بدبختانہ حکم کے پوری طرح ذمہ دار نہیں تھے انہیں اپنے حرم کے خواتین کے دباؤ کے تحت ایسا کرنا پڑ رہا تھا جو اس زمانہ کے ایک عجیب و غریب دستور کے تحت شاہی لشکر میں شریک رہتی تھیں۔ نظام کی چہیتی خاتون نے لڑائی کے منظر سے ہراساں ہو کر یہ دھمکی دی کہ اگر قریب کے قلعہ میں فوراً پناہ نہ لی گئی تو وہ پردہ سے باہر آجائیں گی۔ یہ دھمکی بہت مہنگی پڑ گئی۔

۱۷؍ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

حسینی شاہد

مبارز الدولہ

خاندان آصفی کا ایک باغی شہزادہ

جنگِ آزادی کے ابتدائی دور میں جن محب وطنوں نے سرفروشی کی روایت عام کی اور دار و رسن کی آزمائشوں کا سواگت کیا ان میں مبارز الدولہ کا نام سرفہرست ہے ان کی سیاسی سرگرمیاں حیدرآباد تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان کا دائرہ عمل مدراس، بمبئی کرنول سے لے کر لاہور اور سندھ تک پھیل گیا تھا۔ انھوں نے ایک طرف وہابی تحریک کے ذریعہ حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر کے مسلمانوں کو منظم و متحد کیا تو دوسری طرف مختلف ریاستوں کے ہندو اور مسلمان رئیسوں اور حکمرانوں سے ربط قائم کر کے ایک ہندستان گیر بغاوت کا منصوبہ تیار کیا تاکہ انگریزوں کے اقتدار کا تختہ اُلٹا جا سکے۔ انہیں اگرچہ اپنے منصوبوں میں کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور زندگی کا بڑا حصہ قید میں گذارنا پڑا لیکن بغاوت کی جو مشعل انھوں نے روشن کی تھی وہ ہزاروں محب وطنوں کے سینوں میں روشن رہی جس کو کوئی طاقت بجھا نہ سکی۔

مبارز الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے اور ناصر الدولہ کے بھائی تھے۔ انگریز دشمنی کا جذبہ انہیں باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ جس نے کم عمری ہی میں جارحانہ صورت اختیار کر لی۔ اس زمانے کے دو واقعات ایسے ہیں جن سے ان کی اٹھان کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸۱۵ء

کی بات ہے کہ ان کے کسی ملازم کا ایک درزی سے جھگڑا ہوگیا جو ریذیڈنسی بازار میں رہتا تھا
مبارز الدولہ کے حکم سے درزی کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع ریذیڈنٹ کو
ملی تو اس نے سکندرآباد سے ایک ہزار سپاہیوں کو (جن کے ساتھ توپیں بھی تھیں) طلب
کر کے مبارز الدولہ کے محل کے محاصرہ کا حکم دیا۔ مبارز الدولہ کے آدمیوں اور ریذیڈنٹ
کی فوج کے درمیان سخت لڑائی ہوئی اور ریذیڈنٹ کی فوج کو ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ تاہم
مبارز الدولہ گرفتار کر لیئے گئے اور انہیں پانچ سال کے لئے گولکنڈہ میں قید کر دیا گیا۔

قید و بند کی مصیبتوں سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ رہائی کے بعد ان کی
سیاسی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں۔ بہت جلد انھوں نے عربوں اور افغانوں کی ایک بھاری
تعداد اپنے گرد جمع کر لی اور اپنے محل کو مدافعت کے نقطۂ نظر سے مستحکم کرنے کے بعد بغاوت
کر دی۔ کرنل اسٹوارڈ کی کمان میں ۹ را پریل ۱۸۳۰ء کو انگریزی فوجوں نے حملہ کیا اور
مبارز الدولہ کو گرفتار کر کے گولکنڈہ میں دوبارہ قید کر دیا گیا۔ اسیری کے زمانے میں بھی وہ
نچلا بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ قلعہ گولکنڈہ میں جو خزانہ تھا اس کو ناصر الدین منتقل کرنا چاہتے
تھے۔ مبارز الدولہ سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ خزانہ کی رقم (۱۰۰ لاکھ سے زیادہ) کس کے
کام آئے گی۔ اس لئے انھوں نے مقاومت کی۔ ناصر الدولہ کے سپاہیوں نے تو مبارز الدولہ
کے خلاف کارروائی نہیں کی البتہ بلارم سے فوجیں آئیں اور صف آرائی ہوئی۔ بڑی مشکل سے
انگریز افسروں نے صورتِ حال پر قابو پایا۔

۱۸۳۸ء میں جنرل فریزر ریذیڈنٹ کی حیثیت سے حیدرآباد آئے جس کے فوراً بعد وہ
واقعہ ہوا، جس کو "وہابی سازش" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہابی تحریک اصل میں مسلمانوں کی سماجی
اصلاحی اور سیاسی بیداری کی بہت بڑی تحریک تھی جس کو سید احمد بریلوی نے اپنے خون سے
پروان چڑھایا۔ ۱۸۲۰ء تک یہ تحریک بنگال سے شمال مغربی صوبہ سرحد اور صوبہ متحدہ سے
مدراس تک، ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی۔ اس کا طاقتور مرکز پٹنہ تھا۔ سید احمد بریلوی

ہندوستان کے اکثر رئیسوں اور ریاستی حکمرانوں سے ربط قائم کئے ہوئے تھے۔ مبارز الدولہ سے بھی ان کی مراسلت تھی۔ انھوں نے مبارز الدولہ کو انگریزوں کے خلاف جہاد میں شرکت کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اگر کسی وجہ سے وہ عملی حصہ نہیں لے سکتے تو مالی امداد کریں اور اپنے سپاہیوں امراء، علماء اور دوسرے لوگوں کو "مجاہدین" کی جماعت میں شامل ہونے کی ترغیب دیں۔

۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی شہید ہوئے لیکن ان کے پیروؤں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انہیں میں سے دو ممتاز لیڈر مولوی ولایت علی اور مولوی سلیم ۱۸۳۸ء میں حیدرآباد آئے۔ ان کا قیام مبارز الدولہ کے ہاں تھا اور انھوں نے عام شہریوں کے علاوہ انگریزی فوجوں میں بھی زور و شور کے ساتھ اپنا پرچار شروع کیا۔ اس زمانے میں مبارز الدولہ کے مخبر اور قاصد، مدراس، بنگلور، کرنول، جودھپور، بھوپال، لاہور، سندھ اور دوسرے شہروں اور ریاستوں میں پھیل گئے تھے جو فقیروں کے بھیس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پیامات لے جاتے، خبریں لاتے اور عوام میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا کرتے تھے۔ انہیں کے ذریعہ مبارز الدولہ مختلف ریاستوں کے حکمرانوں سے ربط قائم کئے ہوئے تھے اور بغاوت کے منصوبے کو آگے بڑھا رہے تھے۔

مبارز الدولہ کی قیادت میں جنھیں رئیس المسلمین کہا جا رہا تھا، وہابی تحریک نے اس وقت زیادہ زور پکڑا جب یہ افواہیں عام ہوئیں کہ روسی وسط ایشیا سے ہندستان کی طرف اقدام کر رہے ہیں۔ وہابیوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری انگریز دشمن طاقتیں بھی اس موقع کی منتظر تھیں۔ مہاراجہ جودھپور، راجہ ستارا، مہاراجہ پٹیالہ، نواب بھوپال، نواب باندہ نواب کرنول اور مبارز الدولہ نے ہندوستان گیر بغاوت کا جو منصوبہ تیار کیا تھا وہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ طے کیا گیا کہ جونہی روسی ہندوستان پہونچیں اپنی اپنی ریاستوں میں بغاوت کر دی جائے۔ اس دوران، ریذیڈنٹ حیدرآباد کو مبارز الدولہ اور نواب کرنول کی خفیہ مراسلت اور ان کے منصوبوں کا پتہ چل گیا اور اس نے ان کی سرکوبی کیلئے ۳۱ نومبر ۱۸۳۹ء

یں کرنول پر حملہ کیا اور مبارز الدولہ اور ان کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ انتہائی مختصر لیکن شدید مقاومت کے بعد کرنول نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور نواب گرفتار کرلئے گئے۔ مبینہ سازش کی تحقیقات کے لئے ریذیڈنٹ کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے تین اراکین انگریز تھے اور تین نظام سرکار کے نامزد تھے۔ کمیشن کے اجلاس ۲۸ جون ۱۸۳۹ء سے مارچ ۱۸۴۰ء تک ہوئے جس کے بعد پوری کارروائی اس سفارش کے ساتھ ۱۸۴۰ء میں حکومت ہند کے پاس بھیج دی گئی کہ مبارز الدولہ اور ان کے ساتھیوں کو سزا دی جائے۔

یہ کمیشن انتہائی غیر قانونی اور اس کی کارروائی غیر آئینی تھی HYDERABAD AFFAIRS اور THE ENGLISH MEN تک نے ان پر نکتہ چینی کی اور کمیشن کی قانونی حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے لکھا کہ وہابی سازش کیس کے ملزمین کے ساتھ جو ناانصافی روا رکھی گئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان اخبارات نے یہ بھی لکھا تھا کہ کمیشن کے دو دو انگریز عہدہ دار پولیس کے عہدہ دار ہیں اور انہیں کے بیانات اور دستاویزات پر مقدمہ تیار کیا گیا ہے۔ اس لئے ان کی حیثیت فریق کی ہوئی اور کسی فریق کو کمیشن میں جگہ دینے کا قانونی جواز نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ نظام کے نامزد اراکین کے بارے میں یہ اظہار خیال کیا گیا تھا کہ ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ انگریز اراکین کی رائے سے انحراف کریں گے۔ اس طرح جو کمیشن تشکیل دیا گیا تھا اس سے انصاف کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی اور یہی ہوا۔ مقدمہ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کمیشن یا کسی دوسری عدالت نے ملزمین کو سزا نہیں سنائی لیکن اس کے باوجود برسوں جیلوں میں سڑتے رہے۔ بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ان کو رہا کر دیا گیا۔ البتہ مبارز الدولہ کو موت سے پہلے قید فرنگ سے رہائی نصیب نہ ہو سکی۔

حیدرآباد کی وہابی تحریک کو جنگ آزادی کی جدوجہد میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے جہاں مبارز الدولہ نے مسلمانوں کو منظم اور متحد کرنے اور فوجوں میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی وہیں ہندو رشیوں اور حکمرانوں

سے ربط پیدا کر کے اس کے دامن کو وسیع تر کیا اور حیدرآباد کی انگریز دشمن طاقتوں کا رشتہ حیدرآباد کے باہر کی طاقتوں سے قائم کر کے پہلی بار انگریز دشمن محب وطنوں کی ایک وسیع متحد محاذ کی بنیاد رکھی۔ ان کی شخصیت حیدرآباد ہی کے لئے نہیں پورے ہندستان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

۲۶ رمئی ۱۹۵۷ء

حسینی شاہد

راجہ مہی پت رام

حیدر آباد کا ایک سرفروش محب وطن

راجہ مہی پت رام نے ایک سرفروش محب وطن کی طرح ساری زندگی انگریزوں کے خلاف جہاد کیا اور وطن کی آزادی کے لئے جان دی۔ دربارِ حیدر آباد میں ان کی موجودگی ریذیڈنسی کے مفادات کے لئے ایک مستقل خطرہ اور میر عالم کی ریشہ دوانیوں کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ سکندر جاہ کے مشیر خاص اور مخالف انگریز سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۰۰ء کے غلامی کے معاہدے کے بعد حیدر آباد کے اندر اور باہر کی وطن دوست طاقتوں کو متحد کر کے انگریز اقتدار کا تختہ الٹنے کی منظم سازش کی اور آخر دم تک اس کو کامیاب بنانے کے لئے جدو جہد کرتے رہے۔

راجہ مہی پت رام برہم کھتری تھے دربار حیدر آباد سے ان کا تعلق ارسطو جاہ (دیوان) کے ذریعہ ہوا اور انھوں نے بہت جلد نظام علی خاں اور ان کے صاحبزادے سکندر جاہ کا اعتماد حاصل کرلیا۔ ابتداء میں انھیں فوج کا سررشتہ دار بنایا گیا جس کی تربیت فرانسیسی ڈھنگ پر ہوئی اور جو موسیو ریمو کے تحت تھی۔ ۱۷۹۸ء میں فرانسیسیوں کا اثر و رسوخ ختم ہوا تو اس فوج کی تنظیم جدید کی گئی اور اس کو راجہ مہی پت رام کی کمان میں دے دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی بعد وہ برار کے گورنر بنا دیئے گئے۔

سکندر جاہ کی تخت نشینی ۱۸۰۳ء کے ایک سال بعد ارسطو جاہ کا انتقال ہوگیا۔ راجہ مہی پت رام کو توقع تھی کہ ارسطو جاہ کی جگہ ان کو دیوان بنایا جائے گا۔ لیکن ریذیڈنٹ کے دباؤ کے تحت میر عالم کو دیوان بنایا گیا۔ میر عالم پر ریذیڈنٹ کو پورا اعتماد تھا لیکن وہ سکندر جاہ کا اعتماد حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ یہیں سے دراصل ریذیڈنٹ اور اس کے ایجنٹوں (میر عالم، چندو لال وغیرہ) اور مہی پت رام، اسمٰعیل یار جنگ اور دوسرے وطن دوست عناصر کے درمیان کشمکش شروع ہوئی جو آگے چل کر بہت شدید ہوگئی تھی۔

۱۸۰۴ء میں انگریزوں نے ہولکر کے خلاف کارروائی کی۔ ۱۸۰۰ء کے معاہدے کے تحت نظام کو اس جنگ میں انگریزوں کی فوجی مدد کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ مہی پت رام نے فوجیں روانہ کیں لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ انگریزوں کو شبہ ہوا کہ مہی پت رام ان کے خلاف ہیں۔ اس شبہ کو اس بات سے اور تقویت پہونچی کہ جو فوجیں مہی پت رام کے تحت تھیں۔ وہ فرانسیسیوں کی تربیت یافتہ تھیں۔

اس معرکے کے بعد مہی پت رام حیدر آباد چلے آئے اور ارسطو جاہ کے رفیق خلوت وجلوت کی حیثیت سے وہ مقام حاصل کر لیا جو کسی اور کو حاصل نہ تھا۔ ریذیڈنٹ اور میر عالم ان کے بڑھتے ہوئے اثر سے خوفزدہ ہوگئے اس لئے کہ ایک طرف میر عالم کا دیوان کی حیثیت سے جو وقار تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور وہ ریذیڈنسی کی سازشوں کے لئے بے اثر ہو چکے تھے تو دوسری طرف مہی پت رام کی وجہ سے انگریز اقتدار کے خلاف جو طاقتیں تھیں وہ طاقتور ہوتی جارہی تھیں اور کمپنی کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ سکندر جاہ خود انگریزوں کے مخالف تھے۔ اب جو مہی پت رام جیسا مشیر ملا تو اس مخالفت کا رنگ اور گہرا ہوگیا۔ اور وہ مہی پت رام اور رگھوتم راؤ کے ان منصوبوں میں گہری دلچسپی لینے لگے جو انگریزوں کی بیخ کنی اور ریاست کے وقار کے سلسلے میں بنا رہے تھے۔ ریذیڈنٹ کو ان منصوبوں کی خبر میر عالم کے ذریعہ ملی تو اس نے فیصلہ کیا کہ بہر قیمت مہی پت رام کو دربار

سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ دربار کے بعض ممتاز امراء اور سربرآوردہ رئیسوں کے ساتھ سازش کر کے سکندر جاہ کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ مہی پت رام کو برار لوٹنے کا حکم دیں۔

مہی پت رام کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ وہ برابر اپنی دھن میں لگے رہے بہت جلد انھوں نے سکندر جاہ کو مرہٹوں سے روابط قائم کرنے پر راضی کر لیا۔ چنانچہ سکندر جاہ کی طرف سے بیش بہا تحفے روانہ کئے گئے اور مہی پت رام کے توسط سے خط وکتابت کا آغاز ہوا۔ یہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی صریحی خلاف ورزی تھی جس کا باعث مہی پت رام تھے اس لئے ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل کو صورت حال سے مطلع کرتے ہوئے درخواست کی کہ نظام کو ہدایت کی جائے کہ مہی پت رام کو برار کی گورنری سے اور اسمٰعیل یار جنگ کو دربار سے برطرف کر دیا جائے۔

۳۱ر ستمبر کو میر عالم نے یہ بہانہ کر کے کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے ریذیڈنسی میں پناہ لی۔ ۲۸ر نومبر کو ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل کا ایک خط سکندر جاہ کے حوالے کیا جس میں مہی پت رام اور اسمٰعیل یار جنگ کی برطرفی کی ہدایت تھی۔ سکندر جاہ اپنے وفادار امراء کو معزول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور یہ جانتے تھے کہ گورنر جنرل کی ہدایت کی خلاف ورزی کے بعد کیا صورتحال پیش آئے گی۔ چنانچہ دفاعی کارروائی شروع کر دی گئی۔ مہی پت رام مظفر الدولہ، نور الامراء کے پاس قاصد روانہ کئے گئے اور شمس الامراء، اسد علی خاں، راجہ راؤ رمبھا اور دوسرے امراء اور جاگیرداروں کے نام احکام جاری کئے گئے۔ فوراً فوجیں روانہ کر دیں۔

ادھر ریذیڈنسی بھی فیصلہ کن کارروائی کے لئے تیار ہو گئی اور سکندر آباد کی فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا۔ اس خبر سے بعض امراء میں تشویش پھیل گئی اور ان کی طرف سے امجد الملک نے نظام کو عواقب سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ فی الحال گورنر جنرل کے احکام کی تعمیل ہی مناسب ہے۔ چنانچہ مہی پت رام کی معزولی اور ان کی جگہ چندو لال کے

بھائی گوبند بخش کے تقرر اور اسمٰعیل یار جنگ کی برطرفی کے احکام جاری کر دیئے گئے مہی پت رام کے نام یہ حکم بھی جاری کیا گیا کہ وہ (گلبرگہ) چلے جائیں۔

ابتداء میں مہی پت رام نے بغاوت کی تیاری شروع کی لیکن برار کے امراء کو معلوم ہو چکا تھا کہ گوبند بخش انگریزی فوجوں کے ساتھ آرہے ہیں اس لئے انھوں نے رفاقت کے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً مہی پت رام نے ناگپور فرار ہو جانے کا ارادہ کیا۔ ایسے میں ان کے بڑے بھائی اننت رام کا حیدرآباد سے خط آیا جس کے بعد وہ سگہ روانہ ہو گئے۔ سگہ پہنچتے ہی انھوں نے ایک طرف اورنگ آباد۔ پونا، باسم سے اور دوسری طرف سکندرآباد اور حیدرآباد کے رئیسوں سے مراسلت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور ادھر شولاپور کے راجہ سے ربط و ضبط بڑھایا اور اتنا اثر پیدا کیا کہ وہاں کے پرانے دیوان کو ہٹا کر اس کی جگہ اپنے کسی ہم خیال کا تقرر کروایا۔ ساتھ ہی اپنی فوجوں کی تعداد بھی بڑھادی۔

مہی پت رام کی معزولی کے بعد حیدرآباد میں وہ طاقتیں کمزور ہو گئیں تھیں جو برطانوی اقتدار کے خلاف تھیں اور نظام ریذیڈنٹ اور میر عالم کی گرفت میں آگئے تھے۔ اس صورتحال کا فائدہ اُٹھا کر میر عالم نے مہی پت رام کے خاتمے پر کمر باندھی اور ان کی سرکوبی کے لئے مسٹر گورڈن اور نظامت جنگ کی قیادت میں فوجیں روانہ کیں۔ شاہ پور کے قریب سکندرجاہ اور مہی پت رام کی فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ اور نظام کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی۔ اور کئی انگریز افسر مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ (۱۳۰۰) پیدل سپاہ میں سے صرف (۳۰۰) اپنی جان سلامت لے جاسکے۔ نظام کی فوجوں کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ریذیڈنٹ نے مزید افواج روانہ کیں جس کی خبر پاکر مہی پت رام اندور بھاگ گئے۔ سمجھا جاتا ہے کہ بعد میں ہولکر کے ساتھ کسی بغاوت میں کام آئے۔

مہی پت رام کی معزولی انگریزوں کی بہت بڑی کامیابی تھی جس کے بعد ہی

ان کے اقتدار کی بنیادیں مستحکم ہو سکیں انہیں اپنے منصوبوں میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن بغاوت کی جو آگ انھوں نے بھڑکائی تھی اس کو کوئی طاقت بجھا نہ سکی۔ آزادی کی جدوجہد کے سورماؤں میں ان کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔

۱۹ر مئی ۱۹۵۷ء

تمکین کاظمی

ماہ لقا بائی چندا

حیدرآباد کی ایک ممتاز مغنیہ

دکن میں رقص و موسیقی بہت قدیم سے موجود ہے۔ اس سلسلہ میں قدیم نام تارامتی، پیماتی کا سُنائی دیتا ہے۔ مگر ان دونوں کی زندگی کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ اور نہ کوئی افسانے ہی ان کے متعلق مشہور ہیں۔ تاریخ دکن میں پہلا نام ماہ لقا بائی چندا کا نظر آتا ہے جو حیدرآباد کی واحد مغنیہ شاعرہ اور حاضر جواب طوائف تھی۔ ابتداء میں اس کے خاندان کی سرپرستی نواب رکن الملک نے کی، ان کے بعد چندا کی سرپرستی نظام علی خاں، ارسطو جاہ میر عالم اور چندو لال کرتے رہے اور اس نے بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کی۔

چندا کسی مخلوط النسل گھرانے کی تھی۔ فطرتاً نیک اور خوش دل عورت تھی۔ تعلیم بھی ضرورت کے موافق ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کا ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس کی نگرانی کے لئے ایک بزرگ ملازم تھے۔ جنہوں نے اسی کتب خانہ سے استفادہ کر کے ایک تاریخ "ماہ نامہ" لکھی ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

چندا کو موسیقی میں بڑا دخل تھا۔ چنانچہ اس کی اسی خصوصیت پر نظام علیخاں بھی مائل تھے۔ اور اکثر سفر میں اسے ساتھ لے جاتے تھے، چنانچہ جاگیر منصب اور خطاب، نوبت نقارہ سے تک سرفراز فرمایا تھا۔ دکن میں یہ پہلی سرفرازی

تھی جو ایک طوائف کو ہوتی تھی ورنہ اتنی بڑی عزت کسی طوائف کو نہ اس سے پہلے ملی اور نہ اس کے بعد۔

چندا شاعرہ بھی تھی اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ جس کا ایک نسخہ اس نے اس زمانہ کے رزیڈنٹ کو دیا تھا۔ جو انڈیا آفس پہنچ گیا۔ ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہے۔ اڈک میٹ جہاں یونیورسٹی بنائی گئی ہے، چندا ہی کی جاگیر تھی۔ اور اسی کی ایک پروردہ حسن لقا بائی کے باغ واقع ناپملی میں مدرسہ نسوان ناپملی بھی قائم ہے۔

چندا کے متعلق یہ تو معلوم ہے کہ وہ گاتی اور ناچتی خوب تھی مگر گانے میں کس قسم کا کمال حاصل تھا فن موسیقی سے واقف اور پورے راگ راگنیوں کو گانا جانتی تھی یا صرف غزل گالیتی تھی کسی نے لکھا ہی نہیں۔ ان دنوں تلنگانہ میں موسیقی کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھی اور نہ رقص ہی فنی حیثیت رکھتا تھا۔ بس یوں ہی چلتا ہوا راگ اور تھرکتی ہوتی راگنی تھی۔ پشواز پھڑکا دینا، گردن کو آگے پیچھے بڑھانا رقص تھا۔ چنانچہ آج سے پچاس سال پہلے تک یہی رقص و غنا عام تھا۔ جسے ہم نے بھی دیکھا اور سنا ہے۔ اور اب تک بھاگوت میں یہی رقص و راگ نظر آتا ہے۔

چندا چونکہ تربیت یافتہ، صحبت یافتہ اور علم مجلسی سے واقف تھی، اس لئے اسے امراء بہت زیادہ چاہتے تھے۔ مشہور ہے کہ راجہ راؤ رنبھا اور گھانسی میاں (سردار الملک) دونوں سے بڑے خصوصی مراسم تھے۔ میر عالمؔ تو باقاعدہ عاشقی بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جو سراپا چندا کا کہا ہے وہ نہایت ہی والہانہ ہے۔ جس کے ایک ایک شعر سے محبت ٹپکتی ہے۔

مشہور ہے کہ چندا آگاتی کم تھی، زیادہ تر شمع محفل ہی بنی رہتی تھی چنانچہ اس کی طاقتِ لسانی پر ہی اکثر لوگ مٹے ہوئے تھے۔

چونکہ دولت خاصی تھی اور خرچ کرنے کے لیئے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اس لئے نذر نیاز، محرم گیارہویں سب ہی کرتی تھی۔ بعض ہندو تہواروں پر بھی دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ دکن میں عام طور پر طوائفوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کرناٹک اور مرہٹواڑے میں، میں نے دیکھا کہ ہندو طوائفیں، محرم، عید الفطر بقرعید، گیارہویں اور بزرگانِ دین کی نذر نیاز بڑی عقیدت سے کرتی ہیں اور مسلمان طوائفیں دیوالی، دسہرہ، تلسنکرات، اگادی، اشٹمی وغیرہ کے تہوار وغیرہ پورے اعتقاد سے مناتی ہیں۔ چندا بھی ہندو تھی نہ مسلمان بس طوائف تھی۔ گو اس نے اپنے لئے مولا کے پہاڑ پر گنبد بنوالیا تھا۔ جہاں دفن ہوئی۔

میر عالم کی منڈی کے سامنے یولجی بیگ (یہ نام ایلچی بیگ نہیں ہے۔ جس طرح کہ عام طور پر مشہور ہے۔ بلکہ یولجی بیگ ہے) کی کمان کے اندر چندا کا مکان تھا۔ جو اس کی نوچیوں میں تقسیم ہو گیا۔ البتہ اس کا عاشور خانہ مدت تک باقی تھا۔ چنانچہ دس بارہ سال پہلے میں نے دیکھا ہے معلوم نہیں اب ہے یا نہیں۔ مشہور ہے کہ چارمینار کے پاس چند کوٹھے بھی اس کے تھے مگر معلوم نہیں کہاں تھے۔ ان کا پتہ نہ چل سکا۔ البتہ یہ مشہور ہے کہ ان کوٹھوں پر شام میں وہ بیٹھا ضرور کرتی تھی۔

چندا کے لطائف بڑے ہی بے ساختہ اور نفیس ہیں چند سن لیجئے:

چارمینار پر چندا کا ایک کوٹھا بھی تھا، جہاں وہ اکثر شام کو بیٹھا کرتی تھی۔ ایک روز وہ کوٹھے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی منچلے بانکے گھوڑے پر سوار کوٹھے کے قریب پہنچے اور لگے اپنی شہسواری کے کرتب دکھانے۔ اتفاقاً اس تفریح میں گھوڑے نے ریح کر دی تو چندا کو بے ساختہ ہنسی آگئی بانکے سوار نے اکڑ کر کہا: "بی جان ہنستی کیا ہو

یہ مردانِ عالم کی سواری ہے۔ ہم جس پر سوار ہوتے ہیں پدا دیتے ہیں"۔ یہ سنکر چندا نے بڑی مسرت سے پوچھا خاں صاحب! پھر تو گھر والی پدمن ہوگئی ہوگی؟" اب کیا گنجائش تھی خانصاحب نے جو گھوڑے کو سرپٹ چھوڑا تو پھر کبھی چارمینار کا رخ نہیں کیا۔

کسی مجلس میں چندا بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی امیر تشریف لائے، جن کے ساتھ تین، چار نوجوان لڑکے نہایت ہی حسین تنومند اور قوی ہیکل تھے چونکہ چندا نے ان لڑکوں کو حیرت سے دیکھنا شروع کیا۔ اس لئے امیر نے چندا سے مخاطب ہوکر کہا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟ شیر کے بچے ہیں"۔ چندا نے چونک کر جواب دیا: "نواب صاحب! میں تو اس گوی کے تصور میں تھی جہاں سے یہ بچے برآمد ہوئے ہیں"۔ اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔

کسی محفل میں چندا پہنچی تو اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ چونکہ دیر سے گئی تھی۔ اسلئے جلدی سے جوتی اتار کر اندر پہنچی مگر اندر داخل ہوتے ہی کسی نے پکار کر کہا: "بی جان! جوڑا (جوتا) پشواز میں اٹکا ہوا ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے"۔ چندا نے فوراً جواب دیا۔ جی بندی کا جوڑا ساتھ ہی رہتا ہے، البتہ حضور کا جوڑا خدمتگار کی بغل میں رہتا ہے۔

چندا پالکی میں بیٹھی موسٰی ندی میں سے گزر رہی تھی کہ ایک مرد سپاہی بھی راستے سے جا رہے تھے اتفاقاً چندا نے پاندان کھولا تو چوتے کی ڈبیہ جو گول وضع کی تھی لڑھک کر نیچے گر گئی۔ سپاہی صاحب نے کڑک کر کہا: "بی جان نے انڈا دیا"۔ چندا نے پلٹ کر جواب دیا: "حیرت ہے! انڈے میں سے نکلتے ہی چیخنے لگا"۔

دولت کے کرشمے اور روپے کے کھیل چندا کی زندگی میں بہت ہوتے رہے۔ علمائے وقت، فقرائے عہد، مشائخ الکبار، حفاظ محترم اور قاریانِ خوش خواں، تہجد گزار

بزرگ نے چندا کے گھر کا کھانا کھایا' اس کے گھر کا حصہ لینا اس سے نذر و نیاز حاصل کرنا حلال قرار دیا تھا۔ چنانچہ چندا نے ایک میلہ کھٹ درسن کے نام سے مقرر کیا تھا۔ یہ میلہ تین دن تک رہتا تھا۔ پہلے روز بخت ہوتا اور شہر بھر کے علماء و مشائخین فقرا و حفاظ وغیرہ مدعو ہوتے۔ بڑی دھوم دھام کی نیاز ہوتی۔ دوسرے روز ہر ایک مشائخ اور مولوی کے گھر چندا کی طرف سے مٹھائی کی ٹوکریاں بھجوائی جاتیں۔ جس گھر میں جتنے بھی رہنے والے ہوتے ان سب کے نام الگ الگ ایک ایک سیر مٹھائی کی ایک ایک ٹوکری ہوتی تھی جن گھروں میں چالیس پچاس آدمی ہوتے وہاں چالیس' پچاس ٹوکریاں سیر سیر بھر کی بھیجی جاتیں۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ چندا کے گھر پر مشاعرے بھی ہوتے تھے اور خوب داد شعر و شاعری دی جاتی تھی۔ مگر اس کا تحریری ثبوت نہیں مل سکا۔ فدا مہدی صاحب جو فوجی وظیفہ یاب اور چندا کے پڑوسی بزرگوں کے خاندان سے تھے فرمایا کرتے تھے کہ ایک روز چندا نے مشاعرہ مقرر کیا۔ بدن گلابی' دہن گلابی قافیہ رکھ کر طرح دی گئی۔ کوئی بزرگ حیدرآباد میں چپ سادھے ہوتے تھے۔ جن کے دو' صاحبزادے شاعر تھے۔ ان دونوں نے غزلیں سنائیں۔ ایک صاحب کا مطلع تھا ؎

گلاب سے تازہ گال اسکے قبا سراپا چمن گلابی
تمام قد نونہال رنگین مثال غنچہ بدن گلابی

مگر دوسرے بھائی خوشی کے عالم میں تھے چونکہ چندا مشاعرہ میں موجود تھی اسی لئے نشہ دوبالا ہو گیا۔ اور مطلع سنایا ؎

کرے ہے چندا نے پان کھا کر نہ صرف اپنا بدن گلابی
اتارے تو دیکھ لینا سیاہ . . . . . . بدن گلابی

مگر یہ روایت میر فدائے مہدی صاحب کی تھی یہ دونوں مطلعے تذکرہ شعراء

دکن ملکا پوری میں راجہ چندو لال کے مشاعرے کے بتائے گئے ہیں مگر قرین قیاس روایت مہدی صاحب ہی کی ہے۔ کیونکہ چندو لال کی مجلس مشاعرہ میں خواہ مخواہ چندا کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ابتدائً چندا کے مشاعرے میں پڑھے گئے تھے۔ پھر دوبارہ چندو لال کے مشاعرے میں سنائے گئے ہیں۔

بہرحال چندا نے (۵۶) سال نہایت ہی طمطراق سے بسر کئے۔ پیدا ہونے کے بعد سے وزیروں، امیروں ہی کی گود میں رہی اور امرائے دکن ہی نے اسے قبر میں بھی اُتارا۔ یہ اعزاز شاید ہی کسی طوائف کو نصیب ہوا ہو۔ سنہ ۱۲۳۶ھ میں کوہ مولا علی کے پائیں میں اپنے بنوائے ہوئے مقبرہ میں آسودہ ہوئی جو اب شکستہ حال ہے مگر باقی ضرور ہے۔

۱۰ مئی سنہ ۱۹۵۹ء

رائے محبوب نارائن

میر محبوب علی خاں

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی خدمت کے واسطے

یہ تھا "دستور" پیارے محبوب علی پاشا کا جو رعایا کے دلوں پر حکمراں تھا دکن کی سلطنت خاک و خشت کی نہ تھی وہ تو پیار و محبت کی بستی، محبوب اس کا پاشا تھا دلوں پر فتح یابی کشت و خون کرنے سے نہیں ملتی۔ ایثار و قربانی، جذبۂ خدمت گذاری، خلوص سے حاصل ہوتی ہے۔ میکاولی جیسا فلسفی ایسے ہی محبوب العوام، خادم الانعام شاہ کی تمثیل پر جمہوریت کو مہمل کہتا ہے۔ زمانہ کسی کا یار نہیں ہوتا۔ ایک عجیب و غریب ادبار کے بادل، دکن کی فضاء پر چھاگئے تھے۔ ارکاٹ کی سلطنت بارہ باٹ ہوگئی، ٹیپو کی سلطنتِ خداداد، اللہ کو پیاری ہوگئی۔ داد نہ فریاد۔ ہمارے شہر میں کبھی عرب روہیلے دست و گریبان تو کبھی عرب۔ سکھوں کی جھڑپ، کہیں شیعہ سنی برسرِ پیکار کہیں جوانانِ بار کی بغاوت غدر کے بلوائیاں۔ راجہ چندو لال کی سخاوت، کہیں مظفر الملک کی ہنگامہ آرائیاں، مختار الملک پر حملہ۔ فلک پر سیارگان کا اجتماع۔ کبھی زلزلہ، کبھی سورج گرہن کی تاریکی، کبھی موسیٰ کی طغیانی، کبھی قحط۔ مرہٹوں سے الگ نمٹنا تو کمپنی کا بہادر کا جھنجھٹ۔ برار کا برقرار رہنا محال۔ قرض کا چکانا، فرنگی فوجوں کا دباؤ۔ گوروں کی ناز برداریاں۔ ہر طرف تاریکی مایوسی سکون بے حال۔ قرار فرار عوام کا جیون بے حال۔ ہر طرف تاریکی، مایوسی۔ سارا سیاسی سماجی

مطلع مکدر۔

خانوادۂ آصفی کا ایسے میں "چراغ دکن" روشن ہوا۔ نورِ افروز ہوا۔ ملکِ دکن منوّر ہوا حضرت واحد النساء بیگم صاحبہ کے بطن سے۔ ۵ اور ۶ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ کی درمیانی شب (مطابق ۱۸ اگسٹ ۱۸۶۶ء) تاریخ میں زرین قلم سے لکھی گئی۔ ہندو خوش کہ مانک پربھو کا اتارا ہوا۔ مسلم خوش کہ اللہ کی مہربانی سے کئی روحانی بزرگوار مسند ہوئے یہی وجہ تھی کہ ایوان شاد میں ہلالی ماہ کی ہر چھٹی کو فاتحہ۔ قوالی اور مشاعرے ہوتے۔ ۲ سال ۳ ماہ میں دودھ چھٹا۔ دو۲ سال سات مہینے دس دن کے تھے کہ ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ یوم دوشنبہ (۱۸۶۸ء ـ ۱۲۸۵ء) "شاہ مدظلہ" سریر آرائے مسند ہوئے۔ پیلی مسند، پیلے تکئے، پیلی دستار، زریں کلغی۔ دعائے اولیا زرد آصفی بانا ہے۔

غفراں مکان کی زیارت کے روز منجھلی بیگم کی حویلی میں امرائے دولت اور سالارجنگ رزیڈنٹ مسند پہ بٹھا کر ماتم پرسی کی نذریں پیش کیں۔ دوسرے روز دوشنبہ جلوس میمنت مانوس کا دربار منعقد ہوا۔ سفید جامہ اور کرن دار دستار زیب تن۔ انا کی گود میں محل سرا سے برآمد ہوئے۔ مسند نشینی پہ نذریں پیش ہوئیں۔ شادیانے بجے۔ امیر کبیر شمس الامراء (عرف منجھلے میاں) نائب حکومت اور مختار الملک سالار جنگ مدار المہام ہوئے۔ معصوم شاہ۔ مخلص نائب مدبر وزیر خلق اللہ کے امن کی ضمانت ۵ نومبر ۱۸۷۰ء، ۱۰ شعبان ۱۲۸۷ھ کو تسمیہ خوانی کی رسم ادا ہوئی۔ علماء و مشائخ اور ارکان سلطنت کو حسب مراتب خلعت عطا ہوئی۔ تمام شہر میں روشنی کی گئی۔ دو یوم تعطیل ہوئی۔

۱۴ مارچ ۱۸۷۱ء، ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ کو بازو پہ چیچک کا ٹیکہ لگایا گیا۔

اگسٹ ۱۸۷۱ء، ۷ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ محمد زماں خاں (شہید) الف اللہ کا نظارہ، ب کے نکتہ میں بھید سارا پڑھایا۔ کتاب 'جان پہچان' شروع کی۔

۱۱ جمادی الثانی مظفر الدین صاحب خوشنویس نے تختی لکھائی۔ ۱۰ شعبان کو

سورہ الحمد پڑھایا۔ ۹/ذی الحجہ کو گھوڑے کی پہلی سواری فرمائی۔ ۶/ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ سالگرہ مبارک کا پہلا دربار ہوا اور عمائدین سرفراز ہوئے۔ ۸/جمادی الثانی ۹۱ھ روز یکشنبہ پہلی مرتبہ پالکی میں سوار ہوئے۔ ۹/کو جلوس کے ساتھ زیبا باغ (آصف نگر) تشریف لے گئے۔ سڑک کے دو رویہ فوج کھڑی تھی۔ بادشاہ کے دیدار کو اس کی رعایا کا اتنا مجمع کبھی دیکھا نہ گیا تھا۔ ۱۷/جمادی الثانی کو "کوہ پیکر" ہاتھی پر سوار رزیڈنسی تشریف لے گئے۔ حسب دستور سلامی میں توپیں سر ہوئیں۔ لنگم پلی سے ۲۶/جمادی الثانی کو حویلی قدیم ہاتھی پر تشریف لائے۔

نواب ناصرالدولہ کے عہد میں جو ہیرا بطور کفالت تنخواہ فوج کنٹنجنٹ سرکار انگریزی کے حوالہ کیا گیا تھا۔ ۱۲/شعبان سنہ مذکور حضور نے ۳/نومبر واپس لیا۔ ۱۱/رمضان روز جمعہ بادشاہ علی اصلاح ساز نے حضور پرنور کا ختنہ کیا۔ (۲۵۰) روپے بادشاہ علی کو اور باقی تین اصلاح سازوں کو ایک سو پچیس روپے مرحمت ہوئے۔ اس تقریب میں شاہ کے ساتھ ۱۴ لڑکوں کی ختنہ بھی کرائی گئی۔

سکہ چلنی کی بجائے سکہ حالی قرار پایا۔ سکندرآباد سے واڑی تک ریلوے کا افتتاح ہوا۔ ۱۲/مارچ ۲۲/محرم ۱۲۹۲ھ روز سہ شنبہ آغا مرزا (نواب سرورالملک) کو انگریزی اور ترجمہ کے لئے مقرر کیا گیا۔ ۲۴/جمادی الثانی، پہلی دفعہ بگھی میں سوار ہو کر آصف نگر تشریف لے گئے دولہا بادشاہ قبلہ کی درگاہ پر (۲۵۰۰) نذر چڑھایا۔ دوسرے روز حضرت یوسف صاحب شریف صاحب قبلہ کی درگاہ پر جاکر ایک ہزار نذر چڑھائے۔ ۲۹/کو حضرت داود شاہ صاحبؒ کی درگاہ پر حاضری دی۔ (۵۰۰) چڑھائے۔ ۲۱/ذی قعدہ روز دوشنبہ حضور پرنور بگھی سوار سیر کو جارہے تھے۔ صمصام الدولہ کے جلوخانہ کے قریب یکایک گھوڑے بچکے اور تالاب میر جملہ کی طرف بے تحاشہ گاڑی لے کر بھاگے۔ کوچ مین گر گیا۔ گاڑی کا پول ٹوٹ گیا۔ سلنگور حبشی نے گھوڑے کے پیر کاٹ دیئے۔ دائرہ میر مومن پر گھوڑے رکے۔ جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ بہ خیر و خوبی واپسی عمل میں آئی۔

۶ر ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ محمد زماں خاں استاد شاہ کو جب کہ وہ تلاوت میں مصروف تھے، کسی مہدوی پٹھان نے شہید کیا۔ ان کے چھوٹے بھائی مسیح الزماں استاد مقرر ہوئے۔ ۲۲ر رمضان ۹۲ھ آپ نے قرآن شریف ختم فرمایا۔ استاد کو جواہرات، ہم مکتبوں کو جوڑے عطا ہوئے ۲۰ر ذی قعدہ بہ قصد روانگی دہلی بطور پاتراب باغ حسین نقابائی تشریف لے گئے۔ دوسرے دن ہمراہ والدہ صاحبہ اور امراء دربار ذریعہ اسپیشل ٹرین دہلی تشریف لے گئے۔ ہمراہ ریذیڈنٹ اور مختار الملک گورنر جنرل ہند سے ملاقات ہوئی۔

۲۹ر ربیع الاول مختار الملک وزیر اعظم نے وفات پائی۔ بندگان عالی کو سخت رنج ہوا۔ غم ضبط نہ فرما سکے۔ اشک ریز ہوئے۔

نواب آغا مرزا زماں خاں شہید مسٹر کلارک، مسٹر وینس انوار اللہ خاں، حافظ نور الدین محبوب نواز جنگ دولت یار جنگ جیسے اساتذہ سے مستفید ہوئے داغ نے شعر و سخن کی اصلاح دی۔ یکم شوال، پہلی صاحبزادی نظام النساء بیگم پیدا ہوئیں۔ اس خوشی میں امرائے دولت نے ایک سو ایک ماہچے بارگاہ خسروی میں داخل کئے۔

کلکتہ جاکر لارڈ رپن سے ملاقات فرمائی۔ آپ کی تشریف آوری پر کلکتہ میں خاص اہتمام تھا۔ تبریک نامے پیش ہوئے۔ نمائش بھی ملاحظہ کی۔ واپسی میں گلبرگہ محبوب شاہی ملز کا سنگ بنیاد رکھا۔ علماء و فضلاء اور شاستری کو وظائف مقرر فرمایا۔

۴ر ربیع الثانی لارڈ رپن آفتاب محل میں مسند نشینی لارڈ رپن نے فرمائی۔ تحفہ پیش فرمائے۔ کل پر ان کے مکان میں لارڈ رپن کو ڈنر دیا گیا۔ سوئے ہاضمہ کی شکایت پر رزیڈنسی کے سرجن ڈاکٹر بومنٹ کے علاج سے افاقہ ہوا۔ آپ کی اردو نوازی سے ۱۳۰۰ھ میں فارسی کی بجائے کل دفاتر میں اُردو نافذ ہوئی۔

۱۳۰۲ھ میں نظام گارنٹڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کو فروخت کردی گئی۔ نیلگری کا سفر کیا۔ آسمان جاہ کو نیلگری طلب فرمایا۔ اپنے سفر میں بعض پولیٹکل پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں

مگر خیر گذری۔

بجواڑے ریلوے لائن کا افتتاح فرمایا۔ نواب میر لائق علیخاں مدارالمہام کے استعفیٰ پر بہ نفس نفیس کام انجام دیا۔ سر آسمان جاہ لندن گئے وہیں ذریعہ تار مدارالمہام مقرر فرمایا۔

۱۳۰۹ھ ایوان سیف آباد میں مسٹر جیکب کے ہیرے کے مقدمہ میں ذریعہ کمیشن میں حضور پرنور کا بیان ہوا۔ قانونچہ مبارک نافذ ہوا ۲۵ لاکھ کے پرامیسری نوٹس جاری کئے گئے۔

بتقریب سالگرہ مبارک روشنی ہوئی۔ اور باغ عامہ میں تقریب ہوئی۔ سواری جب صدر دروازہ پر پہونچی تو بگھی کے گھوڑے کھول کر ساہو کاروں نے اپنے محبوب باشا کی سواری جلسہ گاہ پہونچائی۔ لارڈ کرزن آئے۔ ڈنر ہوا۔ شیر کا شکار کیا۔ محرم کا لنگر ملاحظہ فرمایا۔

۲۰ جمادی الثانی حالی و چہرہ شاہی سکہ کی بجائے سکہ محبوبیہ مضروب ہوا۔

۱۲ ربیع الاول جدید ضلع بندی کا حکم دیا۔

پل افضل گنج پر جدید گھڑی کا افتتاح فرمایا۔ جشن سالگرہ کی تقریب پر عوام کے ڈپوٹیشن کے طرف سے چار لڑکوں نے اڈریس کا صندوق پیش کیا۔ سونے چاندی کے پھول نچھاور کئے گئے۔ گلپوشی کی گئی۔ محبوب ٹاؤن کا سنگ بنیاد رکھا۔ پایہ میں اخبار مشیر دکن کا تازہ شمارہ رکھا گیا۔ امراء نے نذر پیش کیں۔ شعراء نے گوہر نظم نثار کیا۔ نذرانہ میں (۲۲۶) اشرفیاں (۶۰۰۶) روپے اور رانی سرنا پلی نے ایک ہاتھی پیش کیا۔

آپ اپنی ہی سلطنت میں مقبول نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی آنکھوں کا تارا تھے۔ امور مملکت میں خاص توجہ فرمائی۔ جو اصلاحیں فرمائیں وہ بیدار مغزی اور قابلیت کی دلیل ہے۔

آپ کے عہد زرین میں کئی عمارتیں شہر کی رونق کو دوبالا کیں۔ چوک کا مارکٹ، گھنٹہ گھر باغ۔ باغ عامہ۔ ایوان سیف آباد۔ محل سرور نگر۔ وکٹوریہ میموریل، آرینج ورکشاپ پبلک ورکس آفس۔ کنگ کوٹھی۔ ملک پیٹ سردار ولا۔ حسینی محل۔ حسینی علم کی کمان۔ محبوب گنج۔ زنانہ ہسپتال۔ باغ ایڈن فلک نما۔ سنٹرل جیل لنگم پلی۔ چادر سکندرآباد

قطب شاہی عمارات کی تعمیر و ترمیم۔

سڑکیں تعمیر ہوئیں اور کشادہ بنیں۔ دکانیں ایک وضع کی بنیں۔ افضل گنج۔ فتح میدان چوک میں کلاک ٹاور۔ پرانی حویلی میں کئی عمارتیں بنائی گئیں۔ باقاعدہ پلٹنیں۔ جمعیت نظام محبوب۔ رسالہ جوش۔

میر حسن ایم اے

نواب میر عثمان علی خاں مرحوم

ایک شخص ۔ ایک عہد

روایت ہے کہ خانوادۂ آصفی کے بانی حضرت آصفجاہ اول نے اپنے دور کے ایک خدا رسیدہ بزرگ کی بارگاہ میں حاضری دی تو انھیں سات چپاتیاں عطا ہوئیں اور اسی وجہ سے حیدر آباد کے پرچم پر چپاتی کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ یہ بھی باور کیا جاتا ہے کہ چپاتی کے عطیہ کی برکت سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں اشیائے خوردنی کی کمی شاذ و نادر ہی محسوس کی جاتی تھی۔ میری عمر کے اور مجھ سے بڑے لوگ اس وقت بھی ایسے موجود ہیں جو قدیم حیدرآباد میں زندگی کی آسائشوں اور فراوانیوں سے عرصہ دراز تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔ ارزانی اور فراوانی کے اصل اسباب ظاہر ہے کہ کچھ اور ہی تھے مگر ماننا پڑے گا کہ بانیٔ سلطنت آصفیہ کے نزدیک روٹی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اسی وجہ سے انھوں نے اسے جھنڈے پر چڑھا کر بلند کیا تھا۔

آصف جاہ اول نے نہ صرف پرچم کے انتخاب میں حقیقت پسندی اور ضرورت شناسی کا ثبوت دیا بلکہ ہندو اور مسلمان کو سلطنت کی دو آنکھیں قرار دے کر قطب شاہوں کی اس روادار سرزمین کو مذہبی اور سماجی ہم آہنگی اور تہذیبی یکجہتی کے برگ و بار کو سرسبز اور شاداب رکھنے کی کوشش بھی کی۔ پرسوں ۲۴ فروری ۱۹۶۷ء کو حیدر آباد کے ماضی قریب کی جو جیتی

جاگتی یادگار دنیا سے اُٹھ گئی اس کا تعلق اسی خانوادۂ آصفی سے تھا۔ جس کے پرچم اور حکومت کی پالیسی کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع یعنی خانوادۂ آصفی کے ساتویں حکمران تھے۔ ساتویں لفظ پر یاد آیا کہ چونکہ آصفجاہ اول کو صرف سات چپاتیاں ملی تھیں اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس خاندان میں صرف سات ہی بادشاہ ہوں گے چنانچہ ہوا بھی یہی ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدرآباد' دوسری دیسی ریاستوں کی طرح انڈین یونین میں شریک ہو کر اس کی طاقت اور عظمت میں اضافہ کا باعث بن گئی اور نواب میر عثمان علی خاں مرحوم و مغفور حکمرانی سے سبکدوش ہو کر کچھ عرصہ تک حیدرآباد کے راج پرمکھ رہے اور اس کے بعد اپنی زندگی کے بقیہ ایام ایک قانون پسند' عام اور شریف شہری کی طرح گذارے۔

نواب میر عثمان علی خاں مرحوم ایک بڑی اور اہم ریاست کے مطلق العنان حکمران تھے۔ اس صدی کے اوائل میں جب وہ تخت نشین ہوئے تو حیدرآباد کی مالی حالت' سماجی حالات اور حکومت کے طریق نظم و نسق میں اصلاح کی کافی گنجائش تھی اس کمی کو آصف سابع نے جلد محسوس کیا اور ضروری اصلاحات کی غرض سے عہد آفریں فرامین جاری کئے۔ میلوں اور ٹھیلوں میں اور مختلف مذہبی اور سماجی تقریبات کے موقع پر بعض ناموزوں قسم کے مظاہرے کرنے کا جو رواج چلا آرہا تھا اسے قانون کے ذریعہ روک دیا گیا۔ تعلیم کے لئے مدرسے کھولے گئے جن کے لئے موزوں عمارتیں بنوائی گئیں اور تدریس کے بہتر طریقے رائج کئے گئے۔ آج سے کوئی چالیس سال پہلے حیدرآباد میں پرائمری کی تعلیم سرکاری مدرسوں میں مفت دی جاتی تھی جس کی مثال اس دور میں دنیا کے کسی اور ملک میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ تعلیم کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے نواب میر عثمان علی خاں نے حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اسی تحریک کی بناء پر قائم ہوئی جس میں ہمارے ملک ہندوستان میں پہلی بار ایک ہندوستانی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا گیا اس سے پہلے میٹرک بی اے اور ایم اے

کے امتحانات کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا اور جو لوگ بچوں کی تعلیم پر زیادہ روپیہ صرف کر سکتے تھے وہ ان کو علی گڑھ بھجواتے تھے۔ حیدرآباد کے کم استطاعت عوام کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام عہد عثمانی کا ایک نہایت زبردست کارنامہ ہے۔ اس یونیورسٹی میں تعلیم پائے ہوئے افراد نے ملک کی نمایاں خدمات انجام دیں اور آج عوامی زندگی کے راستے پر بھی ان کے قدم سیدھی سمت میں اور تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو بجا طور پر اس کے بانی نواب میر عثمان علی خاں مرحوم "سلطان العلوم" کہلائے۔ سلطان العلوم کے فیض سے شانتی نکیتن، علی گڑھ یونیورسٹی اور ملک کے کئی تعلیمی ادارے بھی مستفید ہوئے۔ موسیٰ ندی جو بہت مسکین اور معصوم نظر آتی ہے، اس نے گزشتہ صدیوں میں ہمارے شہر کو بارہا بھاری نقصان پہونچائے ہیں۔ اس میں آخری طغیانی ستمبر ۱۹۰۸ء میں آئی تھی جس میں ہزاروں آدمی بہہ گئے اور بے شمار مکانات اور محلے غرق ہو گئے۔ تاریخ میں اس قسم کی بائیس ہلاکت خیز طغیانیوں کا ذکر موجود ہے۔ عہد عثمانی کے اوائل میں اس ندی پر گنڈی پیٹ میں بند باندھ کر طغیانیوں کا ہمیشہ کے لئے سدباب کر دیا گیا۔ اس تعمیر کی بدولت شہر حیدرآباد کے لئے آبرسانی کا بہترین وسیلہ بھی فراہم ہو گیا۔

حمایت ساگر، نظام ساگر، علی ساگر اور ان کے علاوہ بعض بڑے اور اہم تالاب بھی دورِ عثمانی میں بنائے گئے۔ نظام ساگر جس وقت بنا ہے کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا میں کسی اور مقام پر اس قدر بڑا مصنوعی ذخیرۂ آب موجود نہیں تھا۔ شہر حیدرآباد کی رونق پختہ سڑکوں اور نئی خوبصورت عمارتوں جیسے عثمانیہ عدالت العالیہ، عثمانیہ دواخانہ، یونانی دواخانہ، جوبلی ہال، کتب خانۂ آصفیہ اور جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں سے ہے اور ان ساری تعمیرات کا تعلق دورِ عثمانی سے ہے

مرنے والے میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ نواب میر عثمان علی خاں اپنے وقت کے سب سے زیادہ متمول فرد سمجھے جاتے تھے اور غالباً تھے بھی لیکن اس سارے تمول اور جاہ و جلال کے باوجود انھوں نے نہایت سادہ بلکہ فقیرانہ زندگی بسر کی۔

لباس نہایت معمولی پہنتے تھے اور ان کا ذاتی خرچ اتنا بھی نہیں تھا جتنا ایک معمولی سرکاری افسر کا ہوتا ہے۔ کچھ دولت ورثہ میں ملی۔ کفایت شعاری سے کام لے کر اس میں مسلسل اضافہ بھی کرتے رہے۔ حالات بدلے تو وقت کے تقاضوں کو محسوس کر کے اپنے عزیزوں اور وابستگان، یہاں تک کہ خانہ زادوں کے لئے بھی ٹرسٹ قائم کئے۔ نظامس چیاریٹیبل ٹرسٹ تو ایک خیر جاریہ ہے جس سے کسی تفریق کے بغیر بہت سے مستحق اور ضرورتمند فیضیاب ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔

اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے رفتار زمانہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی جانشینی کے لئے پرنس مکرم جاہ جیسے قابل اور روشن خیال اور جوان صالح کا انتخاب فرمایا۔ توقع ہے کہ پرنس موصوف حضور نظام کے موزوں جانشین ثابت ہوں گے اور اہل ملک کے لئے ہمدردی، رواداری، انسان دوستی اور قانون کے احترام کی روایات کو بہر صورت برقرار رکھ کر اپنے خاندان کے نام کو روشن رکھیں گے۔

حضور نظام اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے صدیوں تک یاد رہیں گے۔ حضرت آصف جاہ اول کا بڑا کارنامہ سلطنت آصفیہ کا قیام تھا لیکن مشیت نے نواب میر عثمان علی خاں کو اس سے بھی زیادہ مشکل اور صبر آزما کام کے لئے منتخب کیا تھا اور وہ تھا جدید اصولوں پر ریاست کی ترقی اور بالآخر ملک کی وحدت میں اپنی ریاست کو شریک کر کے اختیار و اقتدار کو عوام کے نمائندوں کے حوالے کر دینا۔ مرنے والے نے یہ سب کچھ کیا اور یہ سمجھنے کے کافی اسباب موجود ہیں کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا مورخین اس کی خوبیوں پر زیادہ زور دینے کی طرف مائل ہوں گے۔

حضور نظام نے بہت سے اچھے کام کئے اور شائد اسی بنا پر ان کی میّت کے جلوس میں لاکھوں سوگواروں نے شرکت کی۔ حیدرآباد میں، میں نے ایسا عظیم جلوسِ جنازہ نہیں دیکھا۔ ہر آنکھ اشکبار، ہر چہرہ متاثر، ہر زبان پر حضور کے تذکرے، یہ خراج اس عظیم شخصیت کے لئے جس نے حکمرانی بھی کی اور جو پھر عوام میں سے ایک بنا رہا اور عوام نے اپنے ممدوح کو بہت بڑا خراج عقیدت پیش کیا۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

۲۶ر فبروری ۶۷ء

رائے محبوب نارائن

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر

اللہ اللہ دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے روشن چراغ گُل ہو گئے۔ قدیم محفلیں سونی پڑی ہیں۔ یہ کیا اندھیر؟ کیا وہ دن لوٹ گئے۔ وہ صحبتیں اُٹھ گئیں؟ کارلائیل کہتا ہے مشاہیر کی حیات قوموں کی حقیقی تاریخ ہے۔ بالکل سچ ہے "فرزند فرخندہ" جس نے مشرقی تہذیب کی بنیاد مضبوط کی۔ ۱۸ر شعبان ۱۲۸۰ھ خاندان چندو لال کا چشم و چراغ مطلع فرخندہ بنیاد پر آفتاب بن کر چمکا۔ کتنے ستاروں کو نور بخشا، کون گنے؟ آنکھ کھلی تو گھر میں شعر و سخن کا چشمہ اُبل رہا تھا۔ نجوم کے حساب سے برہمنوں نے پرشوتم داس نام دیا۔ پریم کے پجاریوں نے کشن پرشاد پکارا، دل شاد تو خدا پرشاد ہوا۔ شاہ دکن نے یمین السلطنۃ خطاب کیا۔ فرنگی تاج نے سر دیا۔ راجہ مہاراجہ بہ سرکار ہوا۔ خاندانی پیشکار ہوا۔ چندو لال شاداں کے صاحبزادے بالا پرشاد ان کے لخت جگر نارائن پرشاد نریندر بہادر، یہ انہیں کے لاڈلے نواسے۔ تعلیم و تربیت کے لئے میر لطف علی کو معلم فرمایا گیا۔ لطف تو یہ ہے کہ یہ ہی موروثی معلم خاندان بنے۔ سید غالب راجہ چندو لال کے معلم اور سید علی ابن سید غالب، راجہ نریندر بہادر کے استاد لطف علی فرزند سید علی تیرہ برس مہاراجہ کو اس طرح لطف علی کا تلطف و کرم حاصل رہا۔ فارسی مرزا علی بابا شوستری سے، عربی سید خلیل صاحب سے، انگریزی نرسہواں چاری مدراسی سے، سنسکرت درگا پرشاد قنوجی سے پڑھی۔ سیاق پیارے لال سے خطاطی، پہلے نجو لال تمکین سے پھر امام الدین ہفت قلم سے پھر مظفر الدین معلی داروغہ مشعل خانہ

سے، جو اپنی خوشخطی سے آنکھوں کو نور بخشتے۔ خط ظفر ناخن سے لکھا جاتا ہے۔

رطب محمد مظفر الدین مزاج سے سیکھی۔ مذ ہیواں چاری کے بعد مسٹر کراؤن انگریزی کا درس دیتے۔ مدرسہ عالیہ ۷۷-۱۸۶۱ء رمبولڈ کی کوٹھی (فتح میدان) پر رسد باغ میں آیا۔ ایڈورڈ سٹین میڈسن معلمان انگریزی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ہیڈسن صاحب رمبولڈ کی کوٹھی ہی میں رہتے تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ نظام کالج کو دیدیا۔ فارسی شعر و سخن کی صلاح حضرت نورالاصفیا ضیاءالدین ضیاء، اور تمکین حیدؔ، داغ اور پھر حضرت غفران مکان آصف سے۔ تیر اندازی عظمت علی شہسواری جلال الدین سے، بنوٹ مراد شاہ سے، تصوف و حقائق چنداشاہ قادری بیدری سے، رمل درویش علی شاہ سے سیکھا۔ ارض الرمل لکھا۔ مشاغل فرصت میں ملمع کار، کارچوب کشیدہ، نجاری، کشتی، دعصرا سازی گنجفہ۔ شطرنج چوسر چنگارانی سب میں ہاتھ صاف تھا۔ واٹر کلر سے زیادہ آئیل کلر پسند تھا۔ بسز پینٹ مرغوب تھا۔ یہ سب مہاراج کی رنگین مزاجی کے ثبوت ہیں تصویر حسن سے رنگ در روغن ضیا پاش۔ غرض ایک ذات تھی کہ شاعر ادیب، صوفی، فقیر، مدار المہام، صدر اعظم، پیشکار۔ شاہ پرستی میں نظیر نہیں۔ ایک دفعہ شاہ عثمان کو بخار آگیا اطلاع ملی اُسی وقت، شاہ صاحب رمال۔ رضا صاحب جفار نجومی حاضر ہوئے صدقہ تجویز ہوا مہاراجہ نے مولوی صاحب (احمد حسین امین جنگ) سے ربط پیدا کیا۔ شاہی اجازت حاصل کی اور صدقہ ساتھ لے کر کنگ کوٹھی پہونچ گئے۔ سامنے صدقہ اُتروایا۔ موٹر سے خیرات کرتے، مٹھیاں پھینکتے ہوئے۔ ایوان شاد کو مراجعت ہوئی۔ ایک دفعہ بلارم میں کوئی ولایتی ناٹک آیا ہوا تھا سرکار معہ ولی عہد برادران و برخورداران تشریف لائے تھے۔ کمنٹنٹ نے فوجیوں کی ساری نشستیں محفوظ کرائیں تھیں۔ یہ تھیٹر رگھوناتھ مل بنکر کا تھا۔ مہاراجہ کچھ دیر سے تشریف لائے کوئی نشست خالی نہ تھی۔ مالک تھیٹر کے صاحبزادے مہاراج کو لئے داخل ہوئے۔ سرکار نے مہاراج کو کھڑے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اسٹیج سے کرسی بھجوائی۔ مہاراجہ نے اُسی وقت پانچ اشرفیاں نذر گزرانی۔ کیا آن بان تھی، کیا اخلاق، سلیقہ شعاری تھی۔ مہاراجہ اپنے عہد کے نمونہ اخلاق تھے۔ کیا روح پرور

نظارے سماج کے اپنے پہلو میں تھے۔ صحبتیں ایسی کہ ان کا اکٹھے ہونا ہی شعور ساز و بلند کردار پیدا کرتا تھا۔

چائے کے بعد باہر نکلنے سے قبل پیشی کی تجوری کا معائنہ فرمالیتے۔ خیرات کے مختلف خانوں میں سکے کرنسی اور تھیلوں میں دھیلیاں۔ پاولیاں، کلدار دوانیاں (کیونکہ حالی دوانی بہت چھوٹی ہوتی اور خیرات پھینکنے سے ضائع جانے کا اندیشہ تھا۔ کچھ اشرفیاں اور کچھ روپے ہوتے تھے۔ چلتی سواری میں تھیلی کا منہ کھلا رہتا۔ وہ معدن لطف و کرم گوہر دریائے جود و سخا' سخاوت کے واقعات کئی جلدوں میں بھی مکمل بیان نہیں ہو سکتے۔ سائل کے حیثیت اور طلب سے زیادہ دے کر سمجھتے کہ کچھ نہیں دیا۔

ایک صاحب تشریف لائے اور اپنی مجبوری ظاہر کی۔ قلمدان میں جو کچھ تھا اُلٹ دیا۔ پانچسو سے کسی طرح کم نہ تھے۔ مگر سائل کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ دونوں ہاتھ باندھے اور دوسری طرف اپنی صورت پھیرے ہوئے فرماتے تھے۔ اس وقت اتنا قبول فرمالیجئے میں شرمندہ ہوں پھر کسی وقت خدمت کروں گا اور سائل سے آنکھ نہ ملاتے تھے۔ ایسے صدہا واقعات ہیں۔ شاد ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ایک جلسہ میں علامہ اقبال کو اقبال کا شعر سنایا

نظارہ کہکشاں نے مجھ کو عجیب نکتہ یہ کل سمجھایا
ہزار گردش رہی فلک کو مگر یہ تارے بہم رہے ہیں

مہاراجہ میں انکسار و تواضع کے ساتھ امارت کا دبدبہ اور دربار داری کی شان بھی بہت بلند تھی۔ چوبدار کی للکار، نقیبوں کی گرج دستار بگوش ہر جگہ دیوڑھی میں چہل پہل نووارد کو مرعوب کر دیتی مگر مہاراجہ سے ملتے ہی ان کے محبت بھرے دو جملے رعب داب انس و محبت سے بدل دیا کرتے۔ ایک تحریر میں بیرونی مفسدہ پردازوں سے فرماتے ہیں' تم دریائے راوی میں طوفان پیدا کرلو مگر موسیٰ علیسیٰ کے سنگم میں افتراق پیدا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے ادیب و شعراء جو اس دربار سے مستفید ہوئے ان کی فہرست طویل ہے۔

اس خم خانے پر سرشار مدہوش تو شہر کی چنگاری کم نہیں۔ خواجہ حسن نظامی، الطاف حسین حالیؔ، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، علامہ اقبالؔ، گرودیو ٹیگور سب ہی جام شاد سے باکیف تھے۔ جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، مرزا فرحت اللہ بیگ، امیر مینائی، اختر مینائی مسعود علی محوی، ضامن کنتوری، غلام مصطفےٰ رسا، عابد مظہر بیگم۔ ترک علیشاہ ترکی۔ مولانا ظہیر بیکش تھانوی، حسن علی طلسمی، عبدالعلی حقانی، عزیز مرزا، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی عمادالملک غرض چوٹی کا ادیب کون تھا جو وابستۂ شاد نہ تھا۔ سب شادؔ کے دستِ کرم کو دیکھتے تھے۔ "اب بھی تیری راہ تکتے ہیں فقیر"

۱۱ر ستمبر ۱۹۷۸ء

آغا حیدر حسن مرزا

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ مرحوم

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ ۱۳ رجون ۱۸۸۹ء کو پونا میں پیدا ہوئے اس وقت ان کے والد نواب میر لائق علی خاں بہادر سالار جنگ منیر الدولہ مختار الملک عماد السلطنت دیوانی سے مستعفی ہو کر پونا میں مقیم تھے۔ جب عماد السلطنت کا وہاں انتقال ہو گیا تو ان کے چھوٹے بھائی نواب میر سعادت علی خاں منیر الملک شجاع الدولہ غیور جنگ، ان کی لاش حیدرآباد لائے اور میر مومن کے دائرہ میں اپنی خاندانی ہڑواڑ میں دفن کیا۔ میر یوسف علی خاں اپنے والد کے انتقال کے وقت ایک سال سے بھی کم عمر کے تھے اور اپنی والدہ حضرۃ زینب بیگم صاحبہ کے ساتھ پونا سے حیدرآباد آگئے۔ حضرۃ زینب بیگم صاحبہ نواب منصور الدولہ کرار جنگ کے خاندان سے تھیں۔ جن کی نوابان بیگن پلی سے قرابت قریبہ تھی۔ زینب بیگم صاحبہ کے والد مجنوں ہو گئے تھے اس لئے ان کے چچا سید عبد الرحمن صاحب نے ان کے تمام معاملات کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ کیونکہ نواب میر سعادت علیخاں جو چھوٹے صاحب کہلاتے تھے، ان کا انتقال بھی اپنے بڑے بھائی عماد السلطنت کے ایک سال بعد ہو گیا۔ نواب میر یوسف علی خاں کی وراثت کے لئے بڑی گندگیاں اچھلیں جس کسی کو اس کی بُو سونگھنی ہو، وہ مثلیں ان کے مقدمہ وراثت کی الٹا کر دیکھ لے۔ جب یہ معاملہ حضرت میر محبوب علی خاں حضور نظام رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں پیش ہوا، حضور مرحوم نے میر یوسف علی خاں کو جائز وارث تسلیم کر لیا۔ سدی عنبر، جو نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ کے دادا میر تراب علی خاں سالار جنگ، شجاع الدولہ مختار الملک جی، سی، ایس، آئی۔ ڈی سی ایل

کا حبشی غلام تھا۔ اس نے نواب میر یوسف علی خاں کی جانی اور مالی حفاظت میں پورا پورا حقِ نمک ادا کیا۔ جب تک سنِ بلوغ کو نہ پہونچے، نواب میر یوسف علی خاں اپنی والدہ کے پاس زنان خانے میں آرام فرماتے، حضرتہ زینب بیگم صاحبہ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ نشت برخاست ادب و آداب جو ایک امیر کے شایان شان ہوں۔ انھوں نے زنانے میں حاصل کئے۔ کھانے پینے میں بہت احتیاط کی جاتی تھی کہ کہیں کوئی مدعی زہر نہ دے دے۔

نواب صاحب کو بچپن سے نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا۔ حتیٰ کہ اپنے کھلونے تک جمع کرتے۔ خوبصورت چیزیں بہت پسند تھیں۔ ان کے خاص دوست جو اُن کے ہم مکتب اور مدرسہ عالیہ کے طالب علم تھے وہ زیادہ تر عہدہ داروں کے لڑکے تھے۔ ایک آدھ جاگیردار بھی تھا۔ اپنے زمانے میں حیدرآباد کے حسینوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور وہ نواب سالار جنگ کے نورتن کہلاتے تھے بعض ان میں سے جنگی اور بہادری کے خطابوں سے سرفراز ہوئے۔ بعض ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوئے۔

نواب سالار جنگ اپنے ان دوستوں سے برابر کا برتاؤ کرتے جو اُن کی والدہ کو ناپسند تھا کیونکہ نواب سالار جنگ اپنے زمانے کے برخلاف ڈیمقراطی اصول ہر آنے جانے والے کے ساتھ برتتے تھے اور ڈیمقراطیت ان کی فطرت ثانیہ ہوگئی تھی۔ لیکن جب ان کی ٹکر کا کوئی امیر آجاتا تو اس کے ساتھ وہ پرانے امیرانہ ٹھاٹ اور تکلف سے ملاقات کرتے، جواہرات کا شوق تھا اور آنکھ بھی اچھی تھی۔ ایک موتی کا کنٹھا تھا جس کے موتیوں کے انتخاب اور رد و بدل میں ان کی عمر بسر ہوئی۔

خط کے پہچاننے میں یہ کمال تھا کہ فوراً دیکھ کر بتا دیتے کہ فلاں استاد کا ہے میر علی ہروی اور عبدالرشید ایلمی کے خط کو بہت پسند فرماتے، اگر کوئی دھوکا دینا چاہتا اور ان کا جعلی نام لکھ کر بتاتا تو دائرے، کشش اور نوک پلک باٹنی کی خامی نکال کر اس

کا جعل ثابت کر دیتے۔ یاقوت کے مخطوط کلام مجید کا بڑی قدر سے ہدیہ دیتے اور لاکھوں سے دریغ نہ کرتے، قلمی تصویروں میں ان کی بصارت حیرت انگیز تھی، کیسے کمال کی نقل ہو اس نقلی ہونا پہچان لیتے تھے۔ قالین کے ٹانکوں اور پھندوں سے بتا دیتے تھے کہ کس علاقہ کی صنعت ہے۔ خود حسین تھے جامہ زیب تھے جو کپڑا جوانی میں پہنتے کھل جاتا، کھلا ہوا گیہواں رنگ، قامت بالا، چھریرا ڈیل ڈول، مرگ کی سی آنکھیں۔ چیتے کی سی کمر، سینہ چوڑا کشادہ پیشانی، خوبصورت چمکیلے دانت، جن کو صبح منہ دھوتے وقت کم از کم آدھ گھنٹے صاف کیا کرتے، گول بڑا سر، خوب گھن کے سیاہ بال، انگریزی وضع کے ترشے صاف داڑھی، ایک زمانے میں مونچھیں بھی صاف کراتے تھے جو اس زمانے کے حیدرآباد کے لئے ایک انوکھی چیز تھی۔ کبھی مونچھیں کتروا کر بھیگی مسوں جیسی رکھتے۔ جامیوار کی شیروانیوں کا بہت شوق تھا۔ اکثر ان میں پچیس پچیس ہزار کے تھان کی ہوں گی۔ ان کے پاس میں نے کوئی شیروانی جامیوار چار پانچ ہزار سے کم کی نہیں دیکھی۔ یہ جامیوار کی شیروانیاں سینکڑوں ہوں گی۔ ٹوئیڈ، سرج، ویٹنگ کی شیروانیاں بھی پہنتے تھے۔ اورنگ آبادی، ہمرو، سنگاریڈی کے ریشم، دمشقی اطلس کی شیروانیاں بناتے، انگریزی لباس بھی زیب تن فرماتے انگریزی ناچ بھی جانتے تھے۔ چوگان بازی کا بہت شوق تھا اور اپنی جوانی میں اچھے شہسوار تھے ان کے گھوڑے گھوڑ دوڑوں میں دوڑتے اور جیتتے تھے۔ اسلحہ کا بھی شوق تھا۔ بڑی عمدہ بندوقیں اور تفنچے خریدتے۔ قدیم اور نادر ہتھیاروں کا اتنا اچھا ذخیرہ تھا کہ وہ کسی اور جگہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان میں بہت سے ہتھیار تاریخی اہمیت رکھتے تھے۔ شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہوگا کہ جس کے نوادرات نواب سالار جنگ کے ہاں موجود نہ ہوں۔ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک محل تعمیر کراؤں گا اور اس میں ان نوادرات کو ترتیب سے سجاؤں گا۔ کبھی وہ محل زار روس کے محل کا نمونہ ہوتا، کبھی کسی اور عظیم الشان وسیع عمارت کی نقل ہوتی۔ کم از کم ان کے نقشے تیار کرانے میں انھوں نے ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ خرچ کیا۔ کبھی یہ محل اور

عجائب خانہ، پونا میں بننے کی تجویز ہوئی، کبھی اوٹی میں کبھی اڈکمیٹ کے مقام پر۔ اسی طرح پندرہ سولہ برس کی عمر سے شادی کا خیال ہوا پہلے اپنی خالہ زاد، پھوپی زاد بہنوں سے شادی کرنی چاہی لیکن والدہ نے خاندانی سیاست کے تحت ان تجویزوں کو نامنظور کیا پھر ریزیڈنٹ کی بیٹیوں سے شادی کرنی چاہی۔ وہ دیسی اور ولایتی اور انگریزی کی ملکی و قومی سیاست نے پروان نہ چڑھنے دی۔ پھر غیر مذہب اور غیر خاندانوں میں رشتہ کرنا چاہا۔ وہاں بھی بیل منڈھے نہ چڑھی۔ غرض نہ محل بنا اور نہ شادی رچی۔ سہرے کے پھول کھلنے تھے پر نہ کھلے اور سہرا جنازے کو بندھا۔ نواب میر یوسف علیخاں کا مطالعہ بہت وسیع تھا وہ کتاب کو جستہ جستہ دیکھتے اور ضخیم کتاب تین چار گھنٹے مطالعہ میں ختم کردیتے کہ جس کو مجھ جیسا پڑھنے والا چار دن میں ختم کرسکے۔ انگریزی، فارسی بہت عمدہ لب و لہجہ میں بولتے۔ اُردو بھی بہت صاف تھی اور اپنے طبقے اور شہر کے بیشتر لوگوں سے بہت صحیح بامحاورہ اُردو بولتے لہجہ بھی ان کا اپنا تھا۔ کاروباری معاملت میں بڑے سوجھ تھے کہ بمبئی کے بڑے بڑے کاروبار کرنے والے ان کا مشورہ لینے آیا کرتے۔ مذہب کے معاملے میں بڑے بے تعصب تھے۔ ان کے دوست ان کے ملازم مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کے تھے کسی سے کوئی پُرخاش نہ تھی، اپنے مذہب اور عقیدے کے بڑے پکے تھے۔ نماز چھپ کر پڑھتے تھے ایک بوسیدہ تہمد بندھا ہوتا اور سر پر ایک معمولی کپڑے کی بوسیدہ گول ٹوپی اگر کوئی ان کو نماز پڑھتے میں دیکھنے کی کوشش کرتا تو بُرا مانتے رمضان کے تیسوں روزے رکھتے۔ ایک مہینے تک دن میں ان کے ہاں دھواں نہ اُٹھتا۔ افطاری اور کھانے اور سحری پر تکلف اور شان کے ہوتے۔ تمام ان کے ملنے والے اور آنے جانے والے روزدار اور روزہ خور سب ہی شریک ہوتے۔ روزہ کا توپ پر انتظار کرتے۔ محرم اور صفر کے مہینوں میں بڑی پابندی سے منہیات سے اجتناب کرتے۔ خیر خیرات اس طرح کرتے کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ سال کے بارہ مہینے صبح دس گیارہ بجے تک دو ڈھائی سو مختلف حاجت مندوں کی درخواستیں گزرتیں۔ جب صبح کی ہوا خوری سے واپس تشریف لاتے شاگرد پیشہ ان درخواستوں کو فوراً پیش کردیتا۔ وہ کھڑے کھڑے ان درخواستوں کو دیکھتے جس نے

ہزار طلب کئے ۔ اس کو سو، جس نے سو مانگے اس کو پچیس تیس، جس نے دس بیس مانگے اس کو دو چار۔ غرض دو روپے سے کم کسی درخواست پر تجویز نہیں کرتے ۔

لیکن لینا ایسا تھا کہ جو رقم لیتا وہ بڑبڑاتا اور برا بھلا جو منہ میں آتا کہتا ۔ طالب علموں کو یک مشت رقم ڈھائی سو تین سو کی دیدیا کرتے، اپنے ننیالی رشتے داروں کو چپکے چپکے خوب دیتے اور ددیالی عزیزوں کی مدد میں بھی کوئی دریغ نہ کرتے ۔ لیکن ان کے پیسے میں ایسا اثر تھا کہ جو لیتا وہ ناراض اور غیر قانع ۔ جوانی اور ادھیڑ عمر تک ان کے منہ سے کبھی کسی نے سخت دل شکن لفظ نہیں سُنا ۔ نوکروں سے بڑی نرمی سے بات کرتے اگر کسی ملازم پر ناراض ہوتے تو خاموش اس کے کرنے کا کام خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے اور وہ بیچارہ سہم کر دہم ہو جاتا ۔ پھر خود فرماتے کہ کیوں کھڑے ہیں، جائیں ۔ وہ دل ہی دل میں نادم افسوس کرتا ۔ اُلٹے قدموں واپس ہوتا اور کام بھی کیا لیتے تھے ۔ جوتے کے بند کھلواتے اور جراب اتروانے کا ۔ اگر اس سے تعمیل میں لغزش ہوتی، ہوں کہہ کر خود ہی بند کھولے جوتا الگ کر کے جُراب اتارلی ۔ اور وہ غریب بن آئی مر گیا ۔ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے بچوں کو بہت چاہتے اور ان کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ۔ نواب صاحب کی دایہ عیسائی تھی اس لئے کرسمس کے دنوں میں نواب صاحب کے ہاں خوب چہل پہل رہتی اور دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے بچوں کے لئے کشتیاں بھر بھر کر نفیس اور اعلیٰ قسم کے کھلونے بھیجتے ۔ ملنے والوں کی عیادت بڑی پابندی سے کرتے، نوکر ادنیٰ ملازم بھی بیمار ہو جاتا تو اس کی خیریت کی کیفیت روز منگواتے جب کوئی ملنے والا مر جاتا اور اس کی خبر سنتے تو اس کی بہت تعریف کرتے اور اپنی اور اس کی محبت کا ذکر کر کے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر اس خوبصورتی سے ضبط گریہ کرتے کہ بسا اوقات میرا مر جانے کو جی چاہا ۔ اسی طرح یہ میرے لئے چشم پر آب ہوں ۔ قزلقی کی ایرانی وضع کی ٹوپی اوڑھتے تھے، لیکن اس کی تراش میں ذرا جدت سے کام لیا وہ سالار جنگی وضع سے مشہور ہو گئی شیروانی کے سینے کی جیبوں پر مثلثی پردہ لگوایا اور اس کی نوک جیب کے وسط میں گنڈی سے

لگائی جاتی اور جیب کتروں سے اور اچکوں کی زد سے محفوظ ہو جاتی۔ وہ وضع بھی حیدر آباد کے نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کا محل اور دستر خوان ہر ایک کے لئے کھلا ہوا تھا۔ خود بہت مختصر کھاتے لیکن ان دستر خوان پر ہمہ نعمت دوسرے لوگ کھاتے، دیسی ولایتی ہر فصل کے میوے، مٹھائیاں، میٹھے اور لذیذ غذائیں سب کے لئے عام تھیں لیکن آپ دو قاشیں نان پاؤ کی کنارے چھوڑ کر صاف بیچ کا گودا، عصلے کی بوٹی پڑا ہوا ٹماٹر کا رس میں پکا ہوا شوربہ جس میں صرف نمک ہوتا، گھی نام کو نہیں خشکہ ایسا اُبلا ہوا کہ رکابی میں ڈالو تو ٹھن ٹھن آواز ہو۔ دو چمچے خشکہ اور دو چمچے شوربہ بنا بوٹی کا۔ کانٹے چمچے سے کوئی آدھ گھنٹے اس سے کھیلتے اور چمچہ میں لے منہ میں ڈال لیتے۔ لے لو کھانا ہو گیا۔ میوے میں انجیر اور شکر گٹھلی آدم۔ دودھیا بھٹے۔ اور تاڑ کا کوبہ۔ باقی میوے مٹھائیاں اور ہمہ قسم کے کھانے آنے جانے والے اور نوکر چاکر خانہ زاد سیر ہو کر کھاتے۔ روز کے معمولی کھانے ان کے ہاں بیس پچیس قسم کے ہوتے تھے اور اور سن کسا نجان، ان کو اپنے وطن اور اپنے اہل وطن کا بڑا پاس اور محبت تھی اور حیدر آباد کو انتہائی عروج پہ دیکھنے کے متمنی تھے، وہ سراپا خوبی تھے۔ آج ان کا مقابلہ اپنے سے کرتا ہوں تو ان کی کمزوریاں میری قابل ناز خوبیوں پر فوقیت پا جاتی ہیں جو باہر سے کوئی حیدر آباد کی سیر کو آتا تو سالار جنگ کے ہاں ایک وقت کا کھانا کھلوا دیا اور ان سے ملوا دیا۔ لو صاحب' سارے حیدر آباد کی شائستگی تہذیب اور امارت کے گُن گاتا ہوا وہ عمدہ اثر لے کر رخصت ہوا۔ اللہ پاک ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

۱۵ر اگست ۱۹۵۴ء

فضل الرحمن

سروجنی نائیڈو

سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے اپنے وقت کے ممتاز عالم، سائنسدان اور ماہر تعلیم تھے جنھیں حیدرآباد میں جدید تعلیم کی ترقی اور توسیع کے لئے خاص طور پر کلکتہ سے بُلایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف تعلیم کے علاوہ سماجی اصلاح اور ملک کی عام ترقی کے مسائل سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ آج سے تقریباً سو سال پہلے کے حیدرآباد میں ان کی ماہرانہ رہنمائی میں انگریزی تعلیم کی اشاعت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ کئی انگریزی مدارس اور ایک کالج جو اس وقت حیدرآباد کالج کہلاتا تھا اور جو اب نظام کالج کے نام سے مشہور ہے قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر اگھورناتھ اس کالج کے پہلے پرنسپل اور اس نظام تعلیم کے پہلے سربراہ تھے۔

آج سے ۹۵ سال پہلے شہر حیدرآباد ہی میں سروجنی چٹوپادھیائے پیدا ہوئیں ان کا بچپن علم و ادب کے ماحول میں گذرا جس کو ان کی خداداد ذہانت نے چار چاند لگادیئے بارہ سال کی عمر میں کم سن سروجنی نے مدراس یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا اور ساری یونیورسٹی میں اول آئیں۔ اس عمر سے انھیں شعر شاعری کا ذوق تھا۔ وہ انگریزی میں کئی اچھی اچھی نظمیں لکھنے لگیں تھیں۔ یہ شوق اس حد تک بڑھتا گیا کہ انھیں کالج کی تعلیم سے بھی کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور وہ اپنے شوق کی کتابیں پڑھنے اور اپنے شوق کی چیزیں لکھنے میں دن رات منہمک رہتی تھیں۔ ان کی عمر سولہ سال کی تھی جبکہ سرکار نظام کی طرف

سے انھیں بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کا وظیفہ عطا کیا گیا اور وہ انگلستان روانہ ہوگئیں جہاں تین سال تک وہ زیرِ تعلیم رہیں۔

انگلستان کے قیام کے دوران بھی ان کی شعر گوئی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اُن کے بعض دوستوں نے انھیں اس زمانے کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر ایڈمنڈ گاس سے متعارف کرایا جنھوں نے بڑی توجہ سے ان کی نظمیں سنیں اور انہیں بڑے قیمتی مشورے دیئے۔ اب تک کم سن سروجنی صرف انگریزی موضوعات ہی پر طبع آزمائی کرتی تھیں ایڈمنڈ گاس نے ان سے کہا کہ اس طرح انگریزی شعراء کی نقل سے وہ کوئی اعلیٰ تخلیق نہیں پیش کر سکیں گی انھیں چاہیئے کہ خالص ہندوستانی اور دکنی موضوعات پر قلم اٹھائیں اور اپنے دیس کی زندگی رسوم خیالات اور جذبات کی ترجمانی کے ذریعے انگریزی شاعری کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کرنے کی کوشش کریں۔

سروجنی کو یہ صلاح بہت پسند آئی اور اس کے بعد ان کی شاعری میں ہندوستان اور حیدرآباد کی زندگی کے جیتے جاگتے موقعے جگمگانے لگے۔ خاص کر شہر حیدرآباد کی زندگی جس سے انھیں ایک طرح کا عشق تھا یہ ان کی خوبصورت نظموں میں اس طرح رچ بس گئی کہ آج بھی پڑھنے والے کی نظروں کے سامنے اس دور کا شہر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُبھر آتا ہے۔

انگلستان سے حیدرآباد واپس ہونے کے چند ہی دن بعد سروجنی کی شادی ڈاکٹر گوئنڈا راجلو نائیڈو صاحب سے ہوئی اور اب وہ سروجنی نائیڈو کے نام سے حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر متعارف ہونے لگیں۔ اپنی جوانی کے کئی سال انھوں نے شاعری کے لئے وقف کر دیئے۔ ان کی نظموں اور گیتوں کا پہلا مجموعہ "GOLDEN THRESHOLD" کے نام سے شائع ہوا جسے ملک اور بیرونِ ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مجموعہ کے نام پر انھوں نے خود اپنے مکان کا نام گولڈن تھریشولڈ (سنہرا آستانہ) رکھا۔ اس

کے بعد دو شعری مجموعے BIRD OF TIME "(طائر وقت) اور BROKEN WING (پر شکستہ) کے نام سے شائع ہوئے۔

سروجنی نائیڈو کی نظموں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع، تخیل کی رنگینی۔ جذبات کی گہرائی اور خیال کی بلندی پائی جاتی ہے بلکہ سارے کا سارا کلام رنگین اور نغمگی میں ڈوبا ہوا ہے اور جس کی تاثیر سے پڑھنے والا ایک ایسی خیالی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے جو کسی طلسماتی عالم سے کم نہیں۔

سروجنی نائیڈو انگریزی زبان میں شاعری کرنے والے ہندوستانیوں میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی یہ عالم گیر شہرت محض ان کی شاعری پر موقوف نہیں ہے بلکہ سیاست اور خطابت کے میدان میں بھی پچھلی نسل کے رہنماؤں میں بہت کم لوگ یہ مرتبہ حاصل کر سکے۔ مہاتما گاندھی اور لوکمانیہ تلک کے بعد ان کا شمار صفِ اول کے ان چند محبان وطن میں ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی اور سی۔ آر۔ داس جیسے لیڈروں کے گروہ میں شامل تھے۔

۱۹۰۵ء ہی سے جب تقسیم بنگال کے سلسلے میں ایک زبردست مخالف حکومت تحریک شروع ہوگئی تھی وہ سیاست کے میدان میں داخل ہوگئیں اور ان کی جادو بھری تقریروں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک وہ اپنے سننے والوں میں ایک نئی اُمنگ اور ایک نیا جوش پیدا کر دیتی تھیں۔ پھر چند سال بعد جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی اور سارے ہندوستان میں پُرامن جنگ آزادی کی پہلی تحریک مہاتما گاندھی کے ترک موالات اور عدم تعاون کی شکل میں شروع کی گئی تو سروجنی نائیڈو دیگر کانگریس لیڈروں کے دوش بدوش اس تحریک کو آگے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئیں۔ جنگ آزادی کے سرفروشوں میں ان کو جو مقام حاصل ہوا وہ نہ صرف دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا نتیجہ تھا بلکہ اس میں خلوص اور ایثار کو بھی بڑا دخل ہے جو ان کے کردار کی

بنیادی صفت تھی۔ باوجود خرابئ صحت کے وہ کئی بار جیل کی سزا بھگتیں۔ کئی مرتبہ سول نافرمانی کے ضمن میں پولیس کی لاٹھیاں کھائیں اور جیل سے باہر بھی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں جس حد تک انھوں نے محنت و مشقت کی وہ انھیں کا حصّہ تھا۔

حصول آزادی کے بعد انھوں نے آزاد ہندوستان کی پہلی خاتون گورنر کی حیثیت سے لکھنؤ کے راج بھون میں اپنی زندگی کے آخری دن گذارے۔ یہاں ان کا دربار بادشاہوں کے دربار سے زیادہ عالموں اور شاعروں کی بارگاہ نظر آتا تھا۔ جہاں ہر کس و ناکس کی ہر وقت رسائی تھی۔ یہ وہی لکھنؤ تھا جس میں شاہانِ اودھ کی علمی اور تہذیبی سرپرستی کے چرچے تھے۔ سروجنی کے دورِ حکومت میں پھر ان محفلوں کی یاد تازہ ہونے لگی۔ ان کی محفلوں میں کبھی بھی امیر غریب پڑھے لکھے، ان پڑھ، دیس پردیس، ہندو مسلم، سکھ عیسائی۔ پارسی کا کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ جمہوریہ ہند کی سچی نمائندہ تھیں اور اپنے صوفی منش بزرگوں کی بہترین وارث تھیں حیدرآباد دکن میں جو ان کا وطن تھا۔ ان کا مکان صحیح معنی میں سنہری آستانہ تھا۔ یہ وہ آستانہ تھا جہاں شہر کے بوڑھے اور نوجوان ترقی پسند اور قدیم تہذیب کے دلدادہ، جاگیردار سرمایہ دار کسان اور مزدور غرض ہر گروہ کے افراد نظر آتے تھے۔ وہ ہر ایک سے یکساں شفقت سے پیش آتیں۔ کسی کی مہمان داری میں کوئی تفریق روا نہ رکھتیں۔ اپنے حکیمانہ اقوال اور ظریفانہ لطیفوں سے ہر مہمان کا دل لبھاتیں اور دماغ کو روشن کرتیں۔ ان کے ساتھ دوستوں کی محفلوں میں ان کے نامدار شوہر ڈاکٹر نائیڈو ان کی دونوں صاحبزادیاں مس پدمجا نائیڈو اور مس لیلامنی نائیڈو جو بی بی اور بابی کہلاتی تھیں اور ان کے دونوں فرزند جے سوریہ اور رندھیر جنھیں دوست احباب اور گھر والے بابا اور مینا کہتے تھے۔ ان شبانہ روز محفلوں میں شریک ہوتے اور محفل کی رونق بڑھانے میں کوشاں رہتے اب وہ محفلیں خواب ہوگئیں ہیں۔ ان کی بڑی صاحبزادی مس پدمجا نائیڈو جو کئی سال مغربی بنگال کی گورنر رہ چکی ہیں وہ بھی کئی برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں۔ اگرچہ حیدرآباد سے اب بھی ان کے روحانی اور

سماجی رشتے باقی ہیں۔

بلبل ہند کے مشہور مکان 'GOLDEN THRESHOLD' میں اب شہر کا ایک ہوٹل ہے جہاں ماضی کی شاندار ضیافتوں کی جگہ حال کے کاروباری لنچ اور ڈنر سربراہ کئے جاتے ہیں۔ احباب کو توقع ہے کہ ایک دن اس مکان کو قومی میوزیم بنایا جائے گا جہاں حیدرآباد اور ہندوستان کی اس قابلِ فخر شاعرہ، مصلح خطیب اور مدبّرہ کی زندگی کے موقع محفوظ کئے جائیں گے۔ ویسے اکثر شہروں میں ان کی شایانِ شان کئی یادگاریں قائم ہیں جن سے اہل ملک کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے سروجنی دیوی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، ان کے نامور شوہر ڈاکٹر نائیڈو اور دونوں ہر دلعزیز فرزند بابا اور مینا اور ان کی روشن خیال چھوٹی صاحبزادی لیلامنی نے بھی پچھلے چند برسوں میں یکے بعد دیگرے اس دیار کا سفر اختیار کیا جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں آتا۔ لیکن سنہری آستانے کی دیرینہ محفلوں کے بجھے ہوئے چراغ آج بھی دوستوں کے دلوں میں کبھی کبھی یادوں کے دیئے بن کر جھلملانے لگتے ہیں اور پھر گذری ہوئی خوشیوں اور بیتے ہوئے غموں کے نہ جانے کتنے منظر تصور میں اُبھر آتے ہیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

۲۱ر جولائی ۱۹۷۴ء

گردچرن داس سکینہ

نواب بہادر یار جنگ

دکن کی رنگین سرزمین اور مختلف تہذیبوں کا سنگم حیدرآباد رنگ برنگ کے خوبصورت پھولوں کا گہوارہ بنا رہا ہے جس کی خوشبو کی مہک دور دور تک پھیلی اور لوگوں کے دل و دماغ کو عرصہ دراز تک معطر کرتی رہی۔ ان میں کچھ پھول ایسے بھی تھے جو اپنی زندگی میں سدابہار بنے رہے اور زندگی کے بعد بھی نشان بہار چھوڑ گئے!

نواب سرسالار جنگ مختار الملک جیسے عظیم مدبر اور اپنے وقت کی سیاست میں مہارت کا لوہا آج بھی مانا جاتا ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت جیسے عظیم المرتبت انسان کی زندگی آج بھی اخلاق و آداب، سخاوت و مروت، علم دوستی و ہنر پروری اور با دوستان تلطف، با دشمناں مدارا کے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

بلبل ہند سروجنی نائیڈو اسی حیدرآباد کی بیٹی تھیں جو آسمان شاعری پر درخشاں ستارہ بن کر چمکیں جس طرح انگریزی میں ان کا شاعرانہ تخیل لطیف و حسین انداز میں پرواز کرتا رہا، اسی طرح ان کا سحر آمیز انداز خطابت جاں بازانِ وطن اور مجاہدانِ آزادی کے دلوں میں جوش و ولولے کی ترنگوں کو بڑھاتا جد و جہد آزادی کی طرف رہنمائی کرتا رہا گویا وہ خود مجسم آزادی بنی ہوئی تھیں۔ آج بھی ان کے دلکش اور ولولہ انگیز نغمے کانوں میں گونجتے ہیں اور دیش کی فضاؤں میں ہمیشہ گونجتے رہیں گے۔

نواب سر نظامت جنگ کی عالمانہ صلاحیتیں انجمن علم و عمل کے ذریعہ نوجوانانِ حیدرآباد

کو ایک عرصہ تک فیض پہونچاتی رہیں اور نواب علی نواز جنگ کی فن تعمیر میں ماہرانہ صلاحیتوں نے نظام ساگر اور علی ساگر کو جنم دیا جس کے کنارے بیٹھ کر آج بھی لوگ فردوس کا لُطف اٹھاتے ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ بھی اِسی حیدر آباد کی مٹی سے پیدا ہوئے جن کی شخصیت میں اردو کا ایک بے مثل خطیب ہندوستان کو نصیب ہوا۔ ان کے خطابتی انداز کی یہ تاثیر تھی کہ وہ سننے والوں کے دلوں پر گویا جادو کا اثر کر رہی ہو۔ وہ جس محفل میں بولتے اور جس عنوان پر بولتے ایسا محسوس ہوتا کہ ان کا حسنِ خطابت لوگوں کو مسحور کر رہا ہے اس قوت گویائی نے جو ان میں فطرت نے ودیعت کی تھی' بہادر خاں سے بہادر یار جنگ بنادیا عثمانیہ میڈیکل کالج کی طرف سے میلاد النبیؐ کا جشن منایا جارہا ہے۔ بہادر خاں پیغمبر اسلام کی سیرت پاک کی تصویر اپنے لفظوں میں کھینچ رہے تھے۔ اس وقت حضور نظام کی سواری وہاں پہونچی اور اس تقریر کو سن کر ذات شاہانہ اتنی متاثر ہوئی کہ ایک معزز نوجوان پٹھان کو خطاب سے سرفراز فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ حضور نظام نے اپنی شاہی زندگی میں پہلی بار اس عوامی تقریب میں شرکت کی تھی۔

بہادر خاں نواب نصیب یاور جنگ کے فرزند ارجمند تھے جو ریاست حیدر آباد کے جاگیر دار و جمعدار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ دار العلوم میں تعلیم پائی اور کم عمری میں ہی فارسی اور عربی پر عبور حاصل کر لیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور علامہ شبلی کی سیرۃ النبی نے ان کی قوت تقریر کو پروان چڑھایا اور وہ اسی زبان میں فصاحت کے دریا بہانے لگے۔

بہادر خاں کی لڑکپن کی زندگی اپنے باپ کے ساتھ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے درباری مکتب میں گذری جہاں زندگی کی ہر کروٹ نظر آتی تھی۔ مہاراجہ کی ان میں ساری اچھی خصوصیات جمع ہوگئیں تھیں۔

خاندانی وجاہت، آداب و اخلاق کی تربیت اور امرانہ صحبت کے امتزاج نے ان کی

شخصیت کے قدرتی بانکپن کو خوب تر بنا دیا تھا۔ اپنی خانگی و مجلسی صحبتوں میں ان کی سادگی، ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کی بول چال سب میں ٹھیٹ حیدرآبادی خصوصیتیں نظر آتی تھیں اور مذہب کے اصلی رنگ میں وہ پکے مولوی معلوم ہوتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ کے زورِ خطابت کی دھوم حیدرآباد میں پھیل رہی تھی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب بھی یہاں انھیں سن چکے تھے اصرار کر کے دہلی لے گئے اور دہلی والوں سے ایک نیا ابن بطوطہ کہہ کر ان کا تعارف کرایا۔ ان کی تقریر نے وہاں کے سننے والوں پر بھی خوب اثر ڈالا۔ دیوان چمن لال بھی اتنے متاثر ہوئے کہ اس تقریر کو اپنی طرف سے کتابی شکل میں شائع کرا کے تقسیم کر دیا۔ نواب صاحب کی تقریر کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ جس محفل میں جس موضوع پر بولتے اس کو اسی حد تک محدود رکھتے اور اس قاعدے پر چلتے تھے کہ ہر کام کا ایک مقام ہوتا ہے ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ کئی انجمنیں بیک وقت ان کو دعوت دینے لگیں اور وہ سب کا دل رکھنے کے لئے قبول کرتے گئے۔ تقریروں کی شدت ہی سے ان کے حلق میں اکثر خراش پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ اردو میں ان کی جادو بیانی مسلم لیگ کے عام جلسوں میں ہزاروں مسلمانوں کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ وہ مقبول ہوتے جا رہے تھے اور اپنے مقابل ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو قائدِ اعظم محمد علی جناح بخوشی محسوس کرتے۔ مسلم لیگ سے نواب صاحب پوری طرح وابستہ ہو چکے تھے اور ریاستی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز اتحاد المسلمین حیدرآباد کی بنیاد سے وابستہ تھا اور یہ سیاسی زندگی صرف مسلمانوں کی خدمت تک محدود تھی چنانچہ دکن کے مسلمانوں کا موجودہ سیاسی شعور ان ہی کا رہینِ منت ہے۔

نواب بہادر یار جنگ کی ذات خود ایک انجمن بن گئی تھی وہ متعدد انجمنوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو چکے تھے مجلس جاگیرداران کے معتمد رہے۔ مجلس بلدیہ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ انجمن ترکِ مسکرات کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے اور روور اسکاؤٹس یونین کے مشیر ادارۂ ادبیاتِ

اردو کے خاص معاون و بزم اقبال کے روح رواں اور کتنی ہی تعلیمی سماجی، رفاہی انجمنیں ان کی اعزازی خدمات سے استفادہ کرتی رہیں۔ انجمن مہدویہ، انجمن افاغنہ، اور انجمن تحفظ حقوق العرب اور ایسی ہی کئی اسلامی انجمنوں کی صدارت بھی ان کے تفویض تھی۔ عثمانیہ بلدی جماعت اور انجمن طیلسانین کی معاشی کمیٹی کی بھی وہ رہبری کرتے رہے اور نمائش مصنوعات ملکی کے کاموں میں سرگرمی و دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ جشن سالِ نو کی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے بانیانِ جشن کا حوصلہ بڑھایا۔ انجمن اتحاد و ترقی کو بھی ان کی خاموش تائید حاصل تھی۔ نظام کلب کے مستقل ممبروں میں ان کا نام تھا۔ جاگیر دار والنٹیر کور کے قیام میں انھوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اسکاؤٹنگ تحریک سے انھیں اتنی دلچسپی تھی کہ روورس یونین کے جلسوں میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔ یونین کی طرف سے ایک ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرنے کے لئے آئے تو اسکاوٹ ڈریس پہن کر آئے۔ خاکسار تحریک جب حیدرآباد میں چلی تو نواب صاحب بھی خاکسار بن گئے۔ اسی لباس میں خاکسار دستے کے ساتھ انھوں نے آصفیہ کتب خانے کی نئی عمارت کی رسم افتتاح میں شرکت کی اور اسی لباس میں الٰہ آباد پہونچ کر ہوم منسٹر ڈاکٹر کیلاش ناتھ کنجو سے خاکسار تحریک پر امتناع برخاست کرنے کی نمائندگی کی۔ جنگ کے دوران، انجمن انسداد قلت اجناس کے قیام میں ان کا بڑا حصہ رہا اور غذائی محاذ پر جو مرکزی کمیٹی بنائی گئی اس میں برابر شریک ہوتے رہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر جب تک زندہ رہے نواب صاحب ان کی صحبتوں میں ہمیشہ کی طرح پابندی کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔ الوال کی جاترا میں برابر آتے اور ایوانِ شاد کی ہولی کی دعوتوں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ اپنے ہندو دوستوں میں وہ اتنے ہی بے تکلف تھے جتنے مسلم احباب میں جن خاندانوں کے ساتھ ان کے خاندانی مراسم تھے اس کو ہمیشہ انھوں نے ملحوظ رکھا۔ اپنی دوستی کو انھوں نے سیاسی اختلافات سے کبھی متاثر نہیں کیا۔ ان میں زندہ دلی بھی تھی اور بذلہ سنجی بھی۔ کھانے اور پہننے میں ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی تھی۔
ضرورتمندوں کی مدد اپنے امکان میں جتنی ہوتی ضرور کرتے تھے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور سب سے اچھے دوستانہ تعلقات تھے انتہائی بے تکلف دوستوں میں نواب دوست محمد خاں اور

بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جناب یم نرسنگ راؤ صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب کی بڑی عزت کرتے اور محترمہ سروجنی نائیڈو کو ماں کہتے اور بیرسٹر سری کشن صاحب کو وہ گرو جی کہا کرتے اور ان دونوں بزرگ شخصیتوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ بزرگوں کا ادب، دوستوں سے خلوص و محبت اور چھوٹوں کا پاس و لحاظ ان کا آئین وفا تھا۔ موت بھی عجیب ہوئی خدائی طریق بھی عجیب ہوتے ہیں۔

اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں!

۱۷ر ڈسمبر ۱۹۶۱ء

غلام پنجتن

نواب سر امین جنگ

رچرڈ میڈ نے جب سالار جنگ اول کے خلاف یہاں کے امراء اور با اثر لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا تو منجملہ اور الزاموں کے ان پہ ایک الزام یہ بھی لگاتے تھے کہ انھوں نے حیدرآباد کو پردیسیوں سے بھر دیا ہے۔ عجیب اتفاق تھا کہ جب مسٹر پالوڈن برٹش انڈیا سے لائے ہوئے عہدے داروں سے حیدرآباد خالی کرانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے احمد حسین (سر امین جنگ) اسی زمانے میں یہاں آئے۔ وہ شمالی ارکاٹ کے ایک مشہور خطیب خاندان کے نوجوان فرد تھے۔ ان کے والد جنھیں حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل تھی۔ مدراس میں تجارت کرتے تھے۔ ان کی ابتداء ہی سے تعلیمی حالت نہایت تیز تھی۔ انٹرنس میں بدرجہ اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے انھیں کالج میں گورنرس اسکالرشپ رقمی چالیس روپیہ ملتا رہا۔ ۱۸۸۵ء میں انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس امتحان میں سارے کامیاب طلباء میں ان کا نمبر دوسرا رہا۔ ۱۸۸۸ء میں بی ایل کی قانونی ڈگری حاصل کرکے مدراس کے مشہور بیرسٹر مسٹر نارٹن کے زیر نگرانی انھوں نے وکالت شروع کی اور ۱۸۹۰ء میں وہ مدراس کے وکلائے ہائیکورٹ کی فہرست میں آگئے۔ اسی سال انھوں نے ایم۔ اے بھی کرلیا۔ گورنمنٹ مدراس نے ان کے تعلیمی اعزازوں کے باعث جو انھیں یونیورسٹی میں حاصل ہوئے تھے ضلع ارکاٹ کا ڈپٹی کلکٹر مقرر کیا مگر بقول اکبر الہ آبادی ؎

ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھانس

اس ملازمت کو جس پر کسی ہندوستانی کا تقرر معراج سمجھا جاتا تھا چھوڑ دیا۔ ان کی یونیورسٹی نے انکی تعلیم ختم ہوتے ہی یہ قدر افزائی کی کہ انھیں اردو۔ فارسی اور عربی کا ممتحن بنادیا اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

اس زمانے میں حیدرآباد کا یہ رنگ تھا کہ وزارت سے لے کر چھوٹی ملازمتوں تک کے لئے جوڑ توڑ کا بازار گرم تھا اور بڑے عہدیداروں کی پارٹی بندیوں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ ۱۸۹۲ء کے شروع کے چند مہینوں میں ایک پمفلٹ ایک بنگالی مسٹر مترا کے نام سے شائع ہوا جس میں مولوی مہدی حسن فتح نواز جنگ اور ان کی میم صاحبہ کی جوانی کے افسانے بیان کئے گئے تھے۔ چونکہ ان دونوں کو انگلستان میں قیام کے دوران میں ملکہ وکٹوریہ کی لیوی میں بلائے جانے کا موقع ملا تھا اس لئے مسٹر بلوڈن کو انہیں اور ان کے ساتھ دوسرے عہدیداروں کو جو ان کی نظر میں کھٹکتے تھے پریشان کرنے کا موقع ہاتھ آگیا اس لئے ایک کمیشن اس معاملے کی چھان بین کے لئے مقرر کیا گیا۔ چونکہ نواب سرور الملک مرحوم کو جو اس وقت معتمد پیشی خداوندی تھے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے قابل وکلاء کی ضرورت پیش آئی۔ انھوں نے مدراس کے مسٹر نارٹن اور بمبئی کے مشہور سولیسٹر ایچ ٹو کی خدمات حاصل کیں۔ مسٹر نارٹن کے ساتھ احمد حسین بھی آئے۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب کو اس نوجوان کی قابلیت و فراست اور خاموش طبیعت کا اندازہ ہوا۔ چونکہ اس زمانے میں قانونچہ مبارک کی تدوین و ترتیب کا سوال درپیش تھا۔ انھوں نے ۱۸۹۳ء میں اپنی مددگاری پر ان کا تقرر کرالیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سر آسمان جاہ کی وزارت جھولے لے رہی تھی۔ ریذیڈنسی مداخلت پر تلی ہوئی تھی نوجوان امیروں میں سے چند وزارت کے خواہشمند اور معتمدین اقتدار کے بھوکے تھے۔ اس رسہ کشی کو قانونچہ مبارک کے نفاذ نے ختم کر دیا جس میں تقریباً (۲۶۵) دفعات تھیں جو کیبنٹ کونسل معین المہام، صدرالمہام اور مجلس وضع

قوانین سب پر حاوی تھیں۔ اس کے مسودے کی ترتیب میں مرحوم کو عہدے داروں کے طرزِ عمل۔ سابقہ حکومت کے طریق کار اور شاہانہ اقتدار کی ان سب پر برتری سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ جو تجربہ اس وقت انہیں حاصل ہوا اس سے آگے چل کر ان کو بڑی مدد ملی۔ یوں تو وہ نواب سرور الملک کی سبکدوشی کے وقت ہی سے ان کی جگہ کام کرنے لگے تھے لیکن ۱۸۹۹ء میں حضرت غفران مکاں نے اس خدمت پر متعین کیا اور سفر کلکتہ میں ہمرکاب شاہی کا شرف بخشا۔ لارڈ کرزن کے ۱۹۰۳ء والے دربار دہلی میں بھی وہ اسی حیثیت سے شریک ہوئے جہاں انھوں نے

سب سے اونچی لاٹ کو دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا

برٹش راج کے ٹھاٹ کو دیکھا

حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

جس وقت انھیں معتمدی پیشی خداوندی کی پوری پوری ذمہ داریاں سونپی گئیں، اس وقت ان کی عمر صرف ۳۶ سال کی تھی ان کی فراست دانائی۔ راست بازی اور دیانت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے نہ امراء کی طرف نظر اٹھائی نہ ریذیڈنسی کی طرف بڑھے اور نہ اعلیٰ حکام دیوانی سے پینگ بڑھائے۔ نہ وہ اپنی طرف سے کچھ کہتے تھے اور نہ دوسروں کی سنتے تھے جو عرضداشتیں آتیں ان کو قانونچہ مبارک کی روشنی میں دیکھتے۔ نوٹ مرتب کرتے اور بندگان عالی کے ملاحظہ میں پیش کر دیتے۔ حضرت غفران مکان نے انھیں ۱۹۰۵ء میں چیف سکریٹری کا عہدہ بھی عنایت فرما دیا۔ نظام ہفتم جب سربرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے بھی مولوی صاحب کو ان دونوں خدمتوں پر بحال رکھا۔ ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی میں انھیں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ صدر المہام پیشی مقرر ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں نواب امین جنگ بہادر کے خطاب سے سرفراز

ہوئے۔ جب باب حکومت قائم ہوئی تو اس میں انھوں نے چھ ماہ صدر المہام فینانس کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۲۲ء میں وہ نائٹ کمانڈر آف انڈین ایمپائر بنکر نواب سر امین جنگ بہادر کہلانے لگے۔

رہنے سہنے کے مکان سے ذرا ہٹ کر انھوں نے ایک بڑا کمرہ اپنی لائبریری کے لئے بنالیا تھا سرکاری کاموں سے جب فارغ ہو کر جب گھر لوٹتے تو اپنا وقت اسی کمرے میں مطالعہ کرنے میں صرف کرتے۔ ان کی تنخواہ کا معتدبہ حصہ کتابوں پر خرچ ہوتا تھا باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقائد میں بڑے پکے تھے انہیں سب مذہبوں کی متعلق معلومات بڑھانے کا شوق تھا انھوں نے ایک رسالہ نوٹس ان اسلام انگریزی میں لکھا تھا۔ ان کی علمی تبحّر کا صلہ ۱۹۱۳ء میں یہ ملا کہ وہ رائل اسٹرانامیکل سوسائٹی کے فیلو بنائے گئے اور ۱۹۲۴ء میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بنے۔ انھوں نے مختلف مذہبوں کے تقابلی موضوع پر تھیوسوفیکل (THIOSOPHICAL) سوسائٹی کے جلسوں میں اکثر تقریریں کیں۔ انھوں نے حیدرآباد میں طبّی کانفرنس کی صدارت کی اور خطبہ صدارت میں طب کے مسائل پر ایسے نکتے بیان کئے کہ بہت سے اطبار نے ان کی اس فن سے واقفیت کا کماحقہ اعتراف کیا۔ ان کے مضامین جو مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ٹھوس اور معلومات سے پُر ہوتے تھے۔ ایک زمانے میں انہیں فری میسن جماعت میں شریک ہو کر اس کے رموز و نکات معلوم کرنے کا شوق رہا۔ چونکہ فری میسن اپنے رسوم و تعلیم میں نہایت رازداری برتتے ہیں اور اپنے مخصوص عبارتوں اور اشاروں کو دوسروں پر ظاہر ہونے نہیں دیتے اور اپنی جماعت والوں کو جن سے صورت آشنا بھی نہ ہوں پہچان لیتے تھے اس لئے اس صدیوں پرانی جماعت کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں جہاں جہاں ایسے لاج ہیں ان کو "بھوت گھر" کہا جاتا ہے۔ اس کے مراسم اور کاروبار سب انگریزی زبان میں ہوتے تھے۔ امین جنگ مرحوم کی حوصلہ افزائی سے ان رسوم کے وقت جو عبارتیں پڑھی جاتی ہیں ان کے ترجمہ میں اور اس کے بعد زبانِ اُردو میں کارروائی کرنے والے لاج کے قیام کی گرانڈ لاج آف اسکوٹ

لینڈ سے اجازت حاصل کریں۔ انھوں نے بڑی جانفشانی کی اور اس طرح حیدرآباد لاج کا قیام
عمل میں آیا جو اپنی قسم کا سارے ہندوستان میں صرف ایک ہی لاج ہے۔

انھوں نے کرمن گھاٹ میں ایک باغ اور چھوٹا سا بنگلہ بنالیا تھا جس میں کبھی کبھی اپنے
خاص احباب کو لے کر چلے جایا کرتے تھے اور کچھ تفریح کرلیا کرتے تھے ان کی عادت تھی کہ وہ
کسی محفل میں یا اپنی خانگی ملاقاتوں میں ملکی معاملات پر کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے اس کی وجہ سے
ان کے پاس وہی جاتے تھے جو ان کی ادبی اور اخلاقی صحبتوں سے مستفید ہو سکے۔ جب ڈاکٹر
رابندر ناتھ ٹیگور حیدرآباد آئے تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا۔ دونوں جب بغلگیر ہوئے
تو دونوں کی داڑھیاں مل گئیں۔ مہاراجہ بہادر نے اس واقعہ کو ایک شعر میں موزوں کر دیا۔

محفل میں آج جمع دو صاحب ریش
دونوں دلشاد اور دونوں دلریش

مولانا امجد نے اس پر مندرجہ ذیل دو مصرعے لگا کر رباعی بنا دیا۔

ان دونوں کی مختصر سی تعریف یہ ہے
درویش پرست ایک۔ اک ہے درویش

۸؍ جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

مصورِ جنگ راجہ دین دیال

تصویر ہماری زندگی کی ایک ایسی ضرورت اور قیمتی چیز ہے جسے ہم بالکل محسوس نہیں کرتے۔ یہ تصویر ہی تو ہے جس کے باعث ہم آج بھی ماضی کے ان پہلوؤں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان حالات کا معائنہ کر سکتے ہیں اور اس زمانے سے واقفیت حال کر سکتے ہیں جس میں کبھی ہمارے آبا و اجداد سانس لیا کرتے تھے۔ اگر تصویر نہ ہوتی تو ہم میں اپنے ماضی کو سمجھنے یا ماضی کی ان گنت داستانوں کو پڑھنے کی سکت ہی نہ ہوتی۔ تصویر بنانا خود ایک بہت بڑا فن ہے اور آج کی دنیا میں یہ عظیم فن گلی گلی پھیل کر کاروبار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ۱۸۸۰ء تک یہ حیدرآباد میں تصویر کشی کے نہ کوئی باضابطہ فن کار تھے اور نہ ہی تصویر کشی کا کوئی بڑا مرکز۔ ۱۸۶۲ء میں یعنی آج سے ایک سو دو سال قبل روڑکی کے انجینئرنگ کالج میں ایک نوجوان انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نوجوان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر طلباء ہی نہیں اساتذہ بھی تصویر حیرت بنے پھرتے تھے۔ جب کالج میں امتحانات ختم ہوئے اور نتیجہ نکلا تو دیکھنے والوں نے ایک عدیم المثال حقیقت دیکھی اس نوجوان نے جس کا نام دین دیال تھا، ڈرائینگ میں (۲۵۰) میں سے (۲۶۸) نمبرات حاصل کئے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ دین دیال کی ڈرائینگ کی نفاست و مہارت اور نزاکت کو دیکھ کر ممتحن مجبور ہو گئے تھے کہ اسے مقررہ نمبرات سے بھی زیادہ نمبرات دیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اساتذہ نے دین دیال کو مشورہ دیا کہ وہ اندور کے انجینیرنگ کے دفتر میں جائیداد قبول کریں اور دین دیال نے اس ملازمت کو قبول کر لیا۔ دو سال کے اندر ہی دین دیال نے فوٹوگرافی میں حیرت انگیز کمال حاصل کر لیا جب اس وقت کے گورنر جنرل کے ایجنٹ کو اس نوجوان کی ان صلاحیتوں کا علم ہوا، تو ایجنٹ نے ۱۸۶۵ء میں دین دیال کو ہدایت کی کہ وہ گورنر جنرل کے وسطی ہند کے دورہ کی تصاویر لیں لالہ دین دیال نے اس پہلے سرکاری اور ذمہ دارانہ کام میں اپنے فن کے سارے کمال کا نچوڑ پیش کیا۔ جس سے انگریز گورنر جنرل اور ایجنٹ بیحد متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں گورنر جنرل کے دوسرے ایجنٹ سر بیبیل گریفن نے لالہ دین دیال کو ہدایت دی کہ وہ ہندوستان بھر کے مشہور منادر، مقدس مقامات محلات اور عمارتوں کی تصاویر لیں تاکہ انہیں ایک البم کی شکل میں ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کیا جاسکے۔ لالہ دین دیال نے اس کام کے لئے سختیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہندستان کے کونے کونے کا دورہ کیا۔ اس وقت کئی مقامات تک ریل تو کیا بنڈی کے ذریعہ بھی سفر مشکل تھا۔ لیکن لالہ دین دیال نے کسی نہ کسی طرح اپنے سفر اور کام کی تکمیل کی اور جب اس سخت محنت سے جمع کئے ہوئے البم کو ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ملکہ اس کمال اور خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان تصاویر کو جو آرٹ اور مصوری کا بیش بہا نمونہ ہیں شاہی محل میں رکھا جائے۔ چنانچہ ہندستان کے مشہور مقامات کی یہ تصاویر آج بھی لندن کے ونڈسر پیلیس کے ڈرائینگ روم کی خوبصورتی بڑھا رہی ہیں۔ اب لالہ دین دیال کی شہرت ہندستان جیسے وسیع ملک سے پھیل کر لندن تک جا پہنچی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں لارڈ ڈفرن نے اپنے ایک تعارفی خط کے ساتھ لالہ دین دیال کو نظام حیدرآباد کے پاس روانہ کیا۔ حیدرآباد میں اعلحضرت

غفرانمکاں کی حکمرانی کا دور تھا۔ حیدرآباد میں اس وقت فوٹوگرافر کی حیثیت سے کسی کو بھی نہ شہرت حاصل تھی نہ دربارِ شاہی میں رسائی تھی۔ اعلیٰحضرت غفرانمکاں نے لالہ دین دیال کو اپنا فوٹوگرافر بنالیا۔ پانچ چھ سال تک جب اعلیٰ حضرت نے لالہ دین دیال کے فن کا خاموشی سے جائزہ لیا اور جب اس کمال اور ندرت کے قائل ہوگئے تو لالہ دین دیال کو شاہی دربار کا خصوصی فوٹوگرافر مقرر کرتے ہوئے، "راجہ بہادر مصور جنگ" کا خطاب، اور ماہانہ (۵۰۰) روپے کی منصب کا عطیہ دیا۔ اعلیٰحضرت نے راجہ بہادر مصور جنگ کو اس بات کے لئے بھی آمادہ کرلیا کہ وہ اب حیدرآباد میں ہی مستقل رہائش اختیار کریں گے۔ تب سے اب اور آج تک راجہ دین دیال کا نام حیدرآباد میں مشہور رہے۔ اعلیٰحضرت غفرانمکاں نے راجہ بہادر مصور جنگ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ انہیں ریاست میں بہت سی مراعات دی گئیں۔ وہ جب بھی کہیں باہر جاتے تو راجہ بہادر کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ ایک مرتبہ جب اعلیٰحضرت غفرانمکاں شکار کے لئے باہر گئے ہوئے تھے تو انہوں نے راجہ دین دیال کے کام کا بنظر غور جائزہ لیا اور چونکہ حضور کی طبیعت موزوں تھی فوراً ہی ایک شعر کہا گیا۔ اعلیٰحضرت نے راجہ دین دیال سے کہا: ؎

عجب یہ کرتے ہیں تصویر میں کمال کمال
استادوں کے ہیں استاد راجہ دین دیال

راجہ دین دیال کی نہ صرف ریاست میں بلکہ ملک بھر میں بڑی توقیر ہونے لگی گزشتہ (۸۰) سال کے دوران ریاست کا جس قدر بڑی شخصیتوں نے دورہ کیا۔ راجہ دین دیال ہی نے ان کے دورہ کی تصاویر لیں انہیں چونکہ سرکاری فوٹوگرافر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ آج بھی حاصل ہے۔ اس لئے تمام وی۔ آئی۔ پی مہمانوں کے دورہ میں انہیں ساتھ رکھا جاتا تھا۔ ڈیوک اور ڈچس آف کینٹ، پرنس البرٹ وکٹر

روس کے زار اور روس کے گرانڈ ڈیوک الگزینڈر نے جب ہندستان اور حیدرآباد کا دورہ کیا تو راجہ دین دیال نے اس دورہ کی تصاویر لیں۔ ان کے علاوہ لارڈ اور لیڈی لانسڈاون، آرچ ڈیوک فرانز فردیننڈ آف آسٹریا، لارڈ اور لیڈی ایلجن کے کے دورۂ دکن کی تصاویر بھی راجہ دین دیال کی ہی لی ہوئی ہیں۔ اعلیٰحضرت غفرانمکان کے بعد حضور نظام نے بھی راجہ دین دیال اینڈ سنس کو اپنا خاص فوٹو گرافر مقرر کیا۔ جب راجہ دین دیال کا انتقال ہوا تو ان کے فرزند راجہ گیان چند نے کاروبار سنبھالا۔ اور اپنے والد کے لگائے ہوئے اس پودے کی جو ان کی زندگی ہی میں تناور درخت بن چکا تھا مزید آبیاری کی ہندستان کے تمام وائسرائے نے انہیں اپنا فوٹو گرافر مقرر کیا۔ حیدرآباد میں جتنے ریذیڈنٹ رہے راجہ دین دیال اینڈ سنس کو اپنا فوٹو گرافر مقرر کیا۔ پرنس آف برار نے جو اُس وقت ریاست حیدرآباد کے کمانڈر انچیف اور ولی عہد تھے۔ انہیں اپنا فوٹو گرافر مقرر کیا۔ روس کے زار اور آسٹریا کے قیصر نے راجہ دین دیال کی فوٹو گرافی کی بے حد ستائش کرتے ہوئے سرٹیفکٹ دیئے۔ راجہ دین دیال کو جو اسناد اور سرٹیفکٹ دیئے گئے ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے خود اس کا ایک علیٰحدہ میوزیم بن سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے اپنے سرٹیفکٹ میں تحریر کیا ہے کہ راجہ دین دیال نے جو تصاویر لی ہیں وہ مجھے بے حد پسند آئیں اور میں ان کی محنت اور فن کا قائل ہو گیا۔ انیسویں صدی میں ہندستان اور بیرون ہندستان کے سارے اخبارات نے راجہ دین دیال کی فوٹو گرافی اور ان کے کمالِ فن پر خصوصی مضامین لکھے۔ اخبارات نے انہیں "قومی فوٹو گرافر" کا نام بھی دیا تھا۔

راجہ گیان چند کا سنہ ۱۹۲۰ء میں انتقال ہو گیا اور ان کے (۳) فرزندوں راجہ ترلوک چند، راجہ حکم چند اور راجہ ایکی چند نے تیسری نسل میں بھی اپنے اس قابلِ فخر ورثہ کو برقرار رکھا۔ پولس ایکشن کے بعد ۲۵/ اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء کو میجر جنرل جے این چودھری

ملٹری گورنر نے راجہ دین دیال کو اسٹاف فوٹوگرافر مقرر کیا۔ پہلے ہندستانی گورنر جنرل مسٹر راجگوپال چاری کے علاوہ سابق صدر ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پریسیڈنٹ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بھی انہیں اپنا خاص فوٹوگرافر مقرر کیا۔ ریاست کے سارے گورنرز اور چیف منسٹرز نے بھی انہیں خصوصی فوٹوگرافر تسلیم کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر دکن کی تاریخ لکھی جائے اور راجہ دین دیال سے تعاون حاصل نہ کیا جائے تو اس تاریخ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے معاشرے میں اچکن اور شیروانی سے بشرٹ تک جو تبدیلی آئی ہے کھڑے دوپٹے اور ساری اور ٹائیٹس تک جو منزل عورتوں اور لڑکیوں نے طے کی ہے اسے ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا اسے تو صرف دیکھا جا سکتا ہے۔

راجہ دین دیال کے پاس تقریباً ایک صدی کے دوران لی ہوئی تصاویر میں دکن کی ساری تاریخ موجود ہے۔ اور یہ ایسی تاریخ ہے جسے فراموش کرنے یا گم کر دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر دور میں راجہ دین دیال کو حیدرآباد کے امرائے عظام کی سرکاری اور خانگی دونوں زندگیوں میں بے حد دخل حاصل رہا ہے۔ معمولی تقاریب سے شادیوں تک ہر موقع پر راجہ دین دیال کے کیمرہ کی آنکھ مصروف بہ کار رہا کرتی اس دور میں جب کہ فلیش بلب کی دریافت ہوئی تھی نہ آٹومیٹک فلیش یونٹ ایجاد ہوا تھا، بلکہ دھماکہ خیز پاوڈر کو جلا کر تصویریں لی جاتی تھی۔ راجہ دین دیال نے بڑے بڑے کیمروں سے ایسی تصاویر لی ہیں کہ آج تک جب کہ کیمرہ کے شعبہ میں بے انتہا ترقی ہوتی ہے ان پرانی تصاویر کا کوئی جواب نہیں پیش کیا جا سکا۔

راجہ دین دیال کی تصاویر کو اگر ایک میوزیم میں رکھ دیا جائے تو ہماری نسلیں اس میوزیم کے ذریعہ اپنی پچھلی زندگی کا مشاہدہ کر سکیں گی اور یہ کام اگر مکمل ہو تو کئی تواریخ تحریر کرنے کے مقابلہ میں یہ کام زیادہ اعلیٰ وارفع تصور کیا جائے گا۔

۱۷ مئی ۱۹۶۳ء

رائے محبوب نارائن

سر اکبر حیدری

جدید حیدرآباد کے معمار جنھوں نے نظم و نسق کو مستحکم کیا۔ نواب مختار الملک سالار جنگ، اول کا نام سرفہرست ہے۔ تہذیب و تمدن کے بدلتے ہوئے حالات میں تطابق ماحول ہے جنھوں نے حیات بخشی اُن میں رائٹ آنریبل نواب حیدر نواز جنگ سر محمد اکبر حیدری کے کارنامے بیان کئے بغیر حیدرآباد کی تاریخ شروع نہیں کی جاسکتی۔ سر اکبر واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔

شاہانِ حیدرآباد کی شرفا نوازی اپنی آپ نظیر ہے۔ امرائے سلطنت کو وزیرِ اعظم نہ بنایا جاتا صرف زمام سلطنت ہے، کوئی ایک مدبر جس کا احترام ہمعصر امراء میں تھا، وزارت عظمیٰ کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ البتہ تاریخ ساز ہستیوں میں بیرونِ ملک سے جن کی خدمات مدار المہامی کے لئے حاصل کئے گئے۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہ حضرت میر مومن کو اصفہان سے لائے تھے۔ صرف آصفجاہ سابع کے عہد میں حسب ذیل ہستیاں مستثنیٰ ہیں۔ موئید الملک سر علی امام ۲۔ سر مرزا اسمٰعیل ۳۔ نواب صاحب چھتاری ۴۔ سر اکبر حیدری مگر یہ حیدرآباد ہی کے ہو گئے تھے۔ رہے تو "دلکشا" میں دل خوش مرے تو خطۂ صالحین (دودھ باولی) میں بہ انتظار فردوس جا بسے۔

نام محمد اکبر ولد سیٹھ نذر علی بمبئی کے مشہور و معروف تاجر۔ آبائی وطن کمبات مقام پیدائش بمبئی بتاریخ ۸ر نومبر ۱۸۶۹ء۔ ہندوستان کی نامور شخصیت جسٹس بدرالدین

طیب جی تھے، ان کی حقیقی ہمشیر کے آپ نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ماں اور نانی کی گود میں ہوئی۔ سینٹ زیورس کالج سے بی اے کا امتحان سترہ سال کی عمر میں اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اس کم عمری میں بی اے کلیہ اور جامعہ کے لئے نئی بات تھی اس سے آپ کی اعلیٰ ذہانت خداداد قابلیت۔ علم کا ذوق و شوق ظاہر ہوتا ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ قانونی ڈگری کے لئے شریک ہوئے لیکن حکومت ہند نے محکمہ فینانس کی تربیت کے لئے چن لیا جس میں آپ آنرز سے کامیاب ہوئے۔

۱۸۸۸ء میں افسر حساب ناگپور مقرر ہوئے ایک سال بعد کرنسی آفس لاہور کے افسر مقرر ہوئے پھر کلکتہ لائے گئے۔ تین سال بعد اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل الہ آباد (ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) مقرر ہوئے۔

۱۸۹۳ء میں آپ کا تبادلہ بمبئی ہوا۔ الہ آباد کے اہل ہنود نے آپ کی شاندار وداعی ضیافت کی جس سے آپ کی انسان دوستی، ہمدردی، شریفانہ سلوک، بے تعصبی اور ہردلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں آپ مدراس کے ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد کل ہند و برما کے سرکاری مطابع کی تنقیح و نظارت کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ آپ کی مدلل رپورٹ پر حکومت ہند نے شاندار الفاظ میں بہترین خدمات کا اعتراف کیا۔

آپ کے نمایاں خدمات، انتظامی قابلیت، بہترین کارگزاریوں کی شہرت کی وجہ اس مملکت کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت ہند سے بمشاہرہ سترہ سو پچاس کلدار ۱۹۰۵ء میں آپ کی خدمات صدر محاسبی کیلئے حاصل کی گئیں۔ سر جارج کیسن واکر کی نکتہ رس نگاہوں نے خوب جانچا اور آپ کے گراں قدر مشوروں کا دریا دلی سے اعتراف کیا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ پر فائز ہوئے۔ محکمہ تعلیمات بھی اسی سررشتہ سے متعلق تھا۔ حیدرآباد کی جدید تعلیمی تعمیر کی عاجلانہ ترقی میں یہ خشت اول کا کام کیا جس سے دنیا کی ترقی یافتہ ممالک میں ایک امتیازی مقام حیدرآباد کا پیدا ہوگیا۔ علماء وقت نے عثمانیہ

یونیورسٹی کا خواب دیکھا۔ تعبیر کا اسی ملّانے فال کھولا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کو غیر معمولی جانفشانی کرنی پڑی۔ جامعاتی تعلیم کے لئے بنیادی تعلیم کی داغ بیل ڈالنی پڑی اور پھیلاؤ کرنا پڑا۔ تبلیغ و توسیع تعلیم کا تصور بمنزلہ عبادت تھا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ کی طغیانی، سارے شہر کے ساتھ قدامت کے طور طریق بھی بہالے گئی۔ ۱۹۱۰ء میں غفران مکان ہمارے محبوب بادشاہ' اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عہدِ عثمانی کا آغاز ہوا۔ اس نئے شامیانے کے لئے چوب درسن بھی نئے درکار تھے۔ عالمی جنگ نے باقی تار پود قدیم ادھیڑ ڈالے۔ دنیا نے نئی کروٹ لی۔ سلطان العلوم کی دور رس نظر میں انگریزی کا امتحان لیا۔ اُردو کا نصاب دیا۔ مادری زبان میں تعلیم کا نیا نظریہ' نئی دنیا کی رہنمائی کر رہا تھا۔ دائرۃ المعارف کی حوصلہ افزائی کی۔ دار الترجمہ کی بنیاد رکھی۔ سررشتۂ علاج و صحت عامہ میں نمایاں اصلاحات کیں، دواخانہ، شفاخانہ، انگریزی (ایلوپیتھی) کے ساتھ یونانی اور آیورویدک علاج کے لئے میدان فراہم کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک یورپ اور ایشیاء میں نبرد آزما تھا۔ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد ایجوکیشنل اور ۱۹۱۷ء میں میں کل ہند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

مدراس۔ بمبئی۔ ڈھاکہ۔ علی گڑھ عثمانیہ یونیورسٹی کے آپ رفیق تھے۔ ۱۹۱۹ء میں مسٹر وکفیلڈ صدر ناظم صنعت و حرفت کے رخصت پر جانے سے آپ نے فرائض کے ساتھ یہ خدمت بھی انجام دی۔ لیکن اسی تنگ و تاریک کوچہ کو شاہرہ ترقی پر لگا دیا ماہرین سائنس کے خدمات مستعار لیں کئی حرفتوں کو زندہ کیا۔

کاغذ سازی کے لئے کاغذ نگر۔ شکر سازی کے لئے شکر نگر۔ زر کاغذی کی کتنی مفید اصلاحیں مروج کیں۔ بنکوں کا نظام بدلا۔ شہر کی خوبصورتی کے لئے آرائش بلدہ۔ پیرا رکی واپسی۔ آزادیٔ ہند کی ہمدردی پر غور۔ ۱۹۲۰ء میں آپ بمبئی کے اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر ممتاز ہوئے لیکن جلد ہی حیدر آباد آگئے۔ ۱۹۲۱ء میں

گلانسی کی جگہ باب حکومت کے رکن مقرر ہوئے۔ نظام مالیہ میں جدید انتظام کیا کہ موازنہ کا میزانیہ متوازن ہو گیا۔ فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے وافر رقوم پس انداز ہوئیں۔ رائل ہائنس ایڈورڈ ہشتم کی تشریف آوری پر آپ استقبالیہ کے صدر ہوئے۔ شہزادہ ویلز نے بطور ستائش اپنا فوٹو اور مونوگرام قلمی دستخط ثبت فرما کر عنایت کیا۔ ۱۹۲۵-۲۶ء میں دہلی انٹر یونیورسٹیز کمیٹی کی صدارت کی۔ ۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے کانوکیشن کو خطاب فرمایا جو بہ نظر وقعت دیکھا گیا۔ سنگارینی کالریز کمپنی لمیٹڈ و مجلس معدنیات کے آفیشل ڈائرکٹر ہوئے۔ شاہ آباد سمنٹ کمپنی لمیٹڈ انڈین انڈسٹریل اینڈ جنرل ٹرسٹ لمیٹڈ۔ سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ۔ عثمان شاہی ملز۔ اعظم جاہی ملز۔ انٹر یونیورسٹی بورڈ کے صدر۔ کواپریٹیو کریڈٹ و معدنیات کے صدر المہام ہوئے۔ ین جی ایس ریلوے کی خریدی اور قومیانے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ اردو نستعلیق کی ایجاد۔ اردو طباعت کی نشو و نما آپ کی رہین منت ہے۔ ۲۸ء میں آپ کو سر کا خطاب ملا۔ ۴۱ء میں نواب حیدر نواز جنگ سے سرفراز ہوئے۔ تین گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں حیدرآباد وفد کے قافلہ سالار تھے۔ ۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ کی مشترکہ خاص کمیٹی کے رکن رہے۔ ریزرو بنک کے رکن ریلوے کی کمیٹی کے رکن۔ لیگ آف نیشن کی مالی و معاشی کانفرنس کے مشیر تھے ۳۴ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی کی صدارت کی۔ ۳۶ء میں رائٹ آنریبل کا خطاب ملا۔

(۱) مالیہ کی تنظیم جدید (۲) صنعت و حرفت کی ترقی (۳) تعلیم کا درخشاں فروغ۔ ریلوے کی خریدی۔ ریزیڈنسی علاقہ کی واپسی۔ زر کاغذی کا نفاذ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام بس سرویس کی اجرائی۔ شاہانِ دکن کی امیر المومنین کے خاندان میں رشتۂ ازدواج سے بین الاقوامی تعلقات میں حیدرآباد کا مقام پیدا ہو گیا۔

جلیل القدر صدر اعظم ہونے کے باوجود فقیر منش۔ مجذوبین کے خدمت گذار

مساکین کے حاجت برار۔ مردم شناس۔ قدر پرور۔ آثار قدیمہ کی ترقی میں ایلورہ کی تصاویر اور اجنٹہ کے پتھر کے بُت بھی آپ کی تعریف میں زبانِ حال سے کچھ بولتے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ سر شیخ محمد اقبال۔ شانتی نکیتن۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ مہاتما گاندھی۔ پانڈیچری کے اربندو گھوش اور ڈاکٹر اینی بسنٹ کی تھیاسوفیکل سوسائٹی، اڈیار، رام موہن رائے کا برہمو سماج' کتنی بڑی بڑی ہستیاں' سارے عالم میں آپ کو اپنا سمجھتی تھیں۔ ہندکی نقاشی سے آپ کی دلچسپی آپ کے حسن پرور نظر کا ثبوت ہے۔ آپ نے ۴ صاحبزادے ۲ صاحبزادیاں چھوڑیں۔ اہلِ نظر کو حیدرآباد اور حیدری صاحب میں ایک مستقل نسبت معلوم ہوتی ہے۔

غلام جیلانی
آئی اے ایس ریٹائرڈ

نواب علی نواز جنگ

آندھرا پردیش، نواب علی نواز جنگ کا مرہون منت ہے کہ انھوں نے ریاست میں آبی وسائل کے فروغ کے لئے کلیدی رول ادا کیا۔ انھیں کی دلچسپی اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہم آندھرا پردیش کی سرزمین پر ایشیاء کے عظیم ترین ڈیم کی تجویز اور نظام ساگر، کڈم پراجکٹ، موسیٰ پراجکٹ، اور مانیر پراجکٹ کے دامن میں ہزاروں ایکڑ رقبہ پر سرسبز و شاداب کھیتوں کو لہلہاتا دیکھ رہے ہیں۔ شہر حیدرآباد میں عثمان ساگر اور حمایت ساگر لاکھوں افراد کی پینے کے پانی کی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ ہماری موجودہ نسل کے لئے نواب علی نواز جنگ کا نام بیشک نیا ہو سکتا ہے اور وہ ان کے لئے اجنبی ہو سکتے ہیں لیکن انھوں نے بحیثیت ایک ماہر انجینئر آبرسانی جو کارنامے انجام دیئے وہ انمٹ اور مسلمہ ہیں آنے والے کئی برسوں تک عوام ان آبی وسائل سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ بلاشبہ وہ حیدرآباد کے ان سپوتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے مادر وطن کا نام دنیا بھر میں مشہور کیا۔ نواب علی نواز جنگ جن کا نام میر احمد علی تھا، شہر حیدرآباد میں ۱۱ رتیر ۱۲۸۶ف کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سینٹ جارجس گرامر اسکول میں ہوئی۔ ابتداء ہی سے ریاضی ان کا پسندیدہ مضمون تھا چنانچہ انھوں نے اس مضمون میں ہمیشہ امتیازی کامیابی حاصل کی، متعدد تمغے اور اعزازات حاصل کئے۔ سرکاری امتحان میں ساری ریاست حیدرآباد میں اول آنے پر انھیں نواب عماد الملک کا طلائی تمغہ ملا اور خود مدرسہ کی جانب سے نواب

اکبر جنگ کا طلائی تمغہ ملا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ اور نظام کالج میں بھی تعلیم پائی۔ حکومت حیدرآباد نے ان کی ذہانت اور قابلیت کی قدر کرتے ہوئے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ عطا کیا اور بغرض اعلیٰ تعلیم انگلستان بھیجا جہاں انھوں نے شہرۂ آفاق درس گاہ انجینیرنگ کوپرس ہل کالج میں تعلیم پائی۔ ابتدائی جماعتوں سے امتحانات میں اول آنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہاں بھی قائم رہا چنانچہ انجینیرنگ کے آخری امتحان میں جن امیدواروں نے کامیابی حاصل کی وہ ان میں سر فہرست تھے۔ ان کے ان پروفیسروں نے جنھوں نے بیرونی ممتحن کی حیثیت سے ان کے پرچے جانچے تھے یا ان کا فیلڈ ورک دیکھا تھا۔ انھیں انجینیرنگ جینیس ENGINEERING GENIUS قرار دیا تھا اور انھیں متعدد انعامات اور اعزازات سے نوازا تھا۔

حیدرآباد واپس آنے کے بعد سررشتہ تعمیرات سے منسلک ہوئے اور تیس سال تک اس سے وابستہ رہے۔ انھیں اپنے فن پر بھرپور اعتماد اور قابلیت پر مکمل بھروسہ تھا۔ اس لئے دوران ملازمت اکثر ارباب اثر سے ٹکراؤ رہا جس کی بنا پر وہ جو کرنا چاہتے تھے نہیں کرسکے

علی نواز جنگ کا خصوصی میدان اگرچہ کہ آبپاشی اور آبرسانی تھا لیکن بیشتر عالیشان عمارتیں بھی اسی دور میں ان کے فنی مشوروں سے تعمیر ہوئیں۔ اس خصوص میں دہلی کا حیدرآباد ہاوز خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علی نواز جنگ کو دریائی پانی کے مکمل اور بہتر استعمال کی ایسی دھن تھی کہ انھوں نے مختلف ریاستوں کے مابین تنازعات کو بالائے طاق رکھ کر اسکیموں کو مرتب کرنا ضروری سمجھا۔

جنوبی ہند کے دریاؤں کا انھوں نے خاص طور پر جائزہ لیا اور ان کے بہاؤ اور طغیانیوں کی صورت میں فاضل پانی کی نکاسی سے متعلق انھوں نے ایک فارمولا ایجاد کیا۔ اس فارمولا کے تحت اگر چادروں کی تعمیر کی جائے تو بڑی سے بڑی طغیانی میں پشتوں DAMS کو نقصان نہیں پہنچتا تنگبھدرا پراجکٹ کی تعمیر کے وقت سب سے پہلے اس فارمولے پر عمل کیا گیا۔ علی نواز جنگ کے نام سے موسوم یہ فارمولا آج تک رائج ہے۔ اس فارمولا کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے

ہو سکتا ہے کہ ٹامل ناڈو اور کرناٹک کے علاقوں میں بھی آزمائش کے بعد اس فارمولا کو رائج کر دیا گیا ہے۔

شہر حیدرآباد میں عثمان ساگر اور حمایت ساگر ان ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ نواب علی نواز جنگ کی دور اندیشی اور دوربین نگاہی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس وقت کی محدود ضروریات کے لئے تعمیر کردہ مذکورہ دونوں تالاب آج کی ضروریات جو پندرہ گنا زیادہ ہیں کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اگر صنعتی علاقوں کے لئے پانی کی ضروریات کی تکمیل بھی انھیں ذرائع آب سے نہ کی جاتی تو شاید متبادل ذرائع آب کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

عثمان ساگر اور حمایت ساگر کے علاوہ نواب علی نواز جنگ کے اہم ترین کارناموں میں پالیر، ڈیرا، نظام ساگر، تنگبھدرا پراجکٹ، راجولی بنڈہ پراجکٹ، کڈم پراجکٹ، علی ساگر، موسیٰ پراجکٹ اور مانیر پراجکٹ ہیں لیکن ان میں ناگرجنا ساگر کو زبردست اہمیت حاصل ہے جو دنیا کا سب سے عظیم مینسری ڈیم (MASONARY DAM) ہے۔ اگرچہ ناگرجنا ساگر کی تعمیر نواب علی نواز جنگ کے زمانے میں نہ ہو سکی لیکن اس عظیم پراجکٹ کی جملہ پلاننگ انتخاب مقام تعمیر سے لے کر طرز تعمیر تک علی نواز جنگ کا مرہون منت ہے۔

نواب علی نواز جنگ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے انجنیئر بلکہ ماہر معاشیات بھی تھے انھوں نے اس تعمیر میں معاشی نکتہ نظر کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے غیر معمولی سوجھ بوجھ پائی تھی۔ مددگار مہتمم تعمیرات کے عہدہ سے عملی زندگی کا آغاز ہوا، چیف انجنیئر و معتمد تعمیرات اور مشیر تعمیرات کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دے۔

نواب علی نواز جنگ کا دائرہ عمل صرف ریاست حیدرآباد تک محدود نہ تھا، سارے ہندوستان میں ان کی قابلیت کے چرچے تھے اور جہاں بھی پیچیدہ مسائل سے سابقہ پڑتا، انھیں مشورہ کے لئے ضرور طلب کیا جاتا۔ دریائے سندھ پر سکھر بیراج اگرچہ کہ مشہور انگریز اور ہندوستانی انجنیئروں کے ہاتھوں تعمیر ہوا لیکن پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کے لئے وہاں بھی

نواب علی نواز جنگ سے بدل دی گئی۔ نہ صرف ہندوستان کے مختلف علاقوں بلکہ بیرونی ملکوں بالخصوص انگلستان میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

کسی بھی قسم کے لسانی یا مذہبی تعصب سے کوسوں دُور تھے انھوں نے اپنے دَور میں بلا لحاظ مذہب و ملت صرف ذاتی قابلیت اور کارکردگی کی بنیاد پر ترقیاں دیں یا تقررات کئے بڑے سے بڑے آدمی یا ماتحت کی معمولی سی بھی غلطی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی تھی چنانچہ وہ سخت سست کہنے سے بھی باز نہ آتے، وہ اصلاح کر دیتے اور پھر بھول جاتے۔

نواب علی نواز جنگ کی کانٹریکٹ برج CONTRACT BRIDGE کے کھلاڑی کی حیثیت سے بھی شہرت تھی جو اُن کی تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ لیکن اس کھیل میں بھی وہ کسی کی غلطی برداشت نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اچھے سے اچھا کھلاڑی بھی ان کی میز پر کھیلنے سے گھبراتا تھا۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ملک نے علی نواز جنگ کی جیسی قدر کرنی چاہیئے تھی نہیں کی۔ نہ ہی زندگی میں اور نہ ان کی موت کے بعد، انھوں نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، ان کا موزوں اور مناسب طریقے پر اعتراف ضروری تھا۔ انجینئرنگ کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کے نام سے کوئی شعبہ نہ سہی مگر تمغے اور وظائف جاری کئے جا سکتے تھے، کوئی مستقل یادگار قائم کی جا سکتی تھی لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی جو ایک المیہ ہے۔

غلام پنجتن

راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی

جاگیردارانہ نظام میں امور سلطنت کی انجام دہی نظم و نسق اور امن و امان کی برقراری کا دار و مدار شخصیتوں پر ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ، وزیر اور کوتوالِ شہر۔ بادشاہ اور وزیر کے بعد کوتوال ہی ایک ایسا ذمہ دار عہدہ تھا جو شہر کے تمام دیوانی اور فوجداری معاملات کا آخری تصفیہ کر سکتا تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ مغلیہ دَور سے لے کر قطب شاہی دور تک دار السلطنت میں شہر کی نگرانی، امن و امان کا قیام، چوری، ڈاکہ اور دوسری بدعنوانیوں، تخریبی اور تعزیری اعمال کا انسداد کوتوال کے ذمہ ہوا کرتا تھا۔ مقدمات میں بھی آخری فیصلے کا اختیار کوتوال ہی کو حاصل تھا۔ اس کے علاوہ محصول چنگی کا محکمہ اور دار الضرب بھی کوتوال کے تحت تھے۔ قطب شاہی دَور میں ایک فرانسیسی سیاح موسیو تھیونو گولکنڈہ آیا تھا اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "بھاگ نگر میں بہت سے افسر اور قانون دان لوگ ہیں۔ لیکن ان میں سب سے بڑا کوتوال سمجھا جاتا ہے۔ وہ صرف شہر کا ہی حاکم نہیں بلکہ سلطنت کا چنگی کا محصول بھی وہی وصول کرتا ہے۔

شاہانِ آصفی کے اصولِ حکومت بھی مغلیہ سلاطین کے طور طریق سے متاثر رہے۔ جب کبھی نظم و نسق میں کوئی خرابی ہو جاتی یا کوئی فیصلہ کن مرحلہ پیش آتا تو عوام کی نظریں بادشاہ، وزیر اور کوتوال شہر پر ہی لگ جاتیں اور انھیں سے متعلق سارے شہر میں چہ میگوئیاں پھیل جاتی ہیں دکن کے مورخوں کا بیان ہے کہ یہ حالت نواب سالار جنگ اول کی وزارت تک باقی رہی۔ کیونکہ ان کی وزارت سے قبل کوتوال کا کوئی باضابطہ محکمہ قائم نہیں تھا اور نہ کوئی باقاعدہ پولیس کی

جمعیت تھی ۔ ۱۲۸۲ف میں پہلی مرتبہ ریاست میں ضلع بندی عمل میں آئی ۔ اس وقت ایک باقاعدہ جمعیت کوتوالی قائم کی گئی ۔

عہد عثمانی کے پہلے کوتوال شہر لال خانصاحب تھے ۔ ان کے بعد چند اور اصحاب یکے بعد دیگرے کوتوال بلدہ مقرر ہوئے ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں کوتوالی کے فرائض عمدگی سے انجام دیئے اپنی انتظامی صلاحیتوں اور وفادارانہ خدمات سے بادشاہِ وقت کا اعتماد اور عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کی ۔ نواب عماد جنگ کے انتقال کے بعد راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی کوتوال شہر مقرر ہوئے ۔ پہلے منصرمانہ تقرر عمل میں آیا ۔ بعد میں مستقل ہوئے راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی کی کوتوالی نے عہد مغلیہ کی یاد تازہ کر دی تھی ۔ اس کا مختصر سا تذکرہ ہم ناظرین کے آگے رکھنا چاہتے ہیں ۔

راجہ بہادر کی پیدائش سمستان ونپرتی میں ہوئی ۔ ونپرتی کے راجہ صاحب کے بچوں کے ساتھ آپ کی تعلیم ہوئی ۔ اردو اور فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے ۔ آپ کے ماموں مہتمم پولیس تھے ۔ ماموں کی رہبری اور سعی سے آپ پولیس کی ملازمت میں داخل ہوئے ابتدا میں امینی کی خدمت پر تقرر ہوا اور مختلف اضلاع میں آپ نے خدمات انجام دیں اور بعض اہم مقدموں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ۔ اس لئے آپ مسٹر ہنکن سے زیادہ قریب ہوگئے نواب عماد جنگ کے انتقال پر راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی کو کوتوال شہر مقرر کیا گیا ۔

ان کی کوتوالی کا دور حیدرآباد میں امن اور شانتی کا دور ہے ۔ ملک کے عام حالات سے آپ کی واقفیت کا یہ عالم تھا کہ کسی معمولی سے آدمی کے متعلق بھی پوری معلومات راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی سے حاصل کی جاسکتی تھیں ۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ دواخانۂ عثمانیہ کی ایک نرس نے زہر کھا کر خودکشی کرلی تھی ۔ اس روز شام کو دفتر سے مکان جاتے ہوئے راجہ بہادر نے صدر امین کچہری افضل گنج پر اپنی موٹر ٹھہرائی ۔ مسٹر محمد حسین خاں صدر امین نے نرس کی خودکشی کی رپورٹ پہونچائی تو آپ نے نرس کے خاندان کی پوری تفصیل بیان کر دی ۔ آپ کافی لحیم شحیم تھے ۔ ذاتی

وجاہت اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ لوگ اجلاس پر جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے لیکن مہذب اور شریف لوگوں کے ساتھ ہمیشہ مہذب اور سنجیدہ گفتگو کرتے تھے۔ البتہ پولیس میں پکڑے آنے والے آوارہ منش افراد اور غنڈہ گردی کی ذہنیت رکھنے والے شریر النفس افراد سے مخاطبت میں کچھ گالیوں کی پھول جھڑیاں بھی برستی تھیں۔ بعض اوقات سیاسی لیڈروں کی ایسی درگت بنتی کہ ایسا معلوم ہوتا کہ اب ان کے خلاف عدالت میں چالان پیش کرا کے سزا دلوا دیں گے۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ شروع شروع میں اس قدر رعب جماتے کہ ایسے لیڈر مرعوب ہو کر رہ جاتے اور اپنی غلطی کو محسوس کر لیتے۔ بعد میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ انہیں پند و نصیحت کرتے اور تاکید کر دیتے کہ اگر آئندہ ان کا رویّہ نامناسب رہا تو وہ مجبوراً ان کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔ برائے نام ان سے مچلکہ یا نیک چلنی کا اقرار نامہ لے لیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ خفیہ پولیس کو ہدایت کر دی جاتی کہ ان اشخاص کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ایسی رپورٹیں ہر ہفتہ پیش ہوا کرتیں۔ ایسے اشخاص پر کوتوال صاحب کی گفتگو کا بہت اچھا اثر ہوتا۔

راجہ بہادر کی کوتوالی کے دور میں خلافت کی تحریک سارے ہندوستان میں زور و شور سے جاری تھی۔ حیدرآباد میں بھی یہ تحریک شروع ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان یکساں جوش و خروش کے ساتھ شریک تھے۔ شہر کے مختلف گوشوں میں تحریک خلافت سے متعلق جلسے منعقد ہوتے تھے بیرونِ حیدرآباد کے بعض لیڈروں نے بھی آنا جانا شروع کیا۔ حیدرآبادی ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ مولوی عبدالقیوم صاحب وکیل ہائیکورٹ کی صدارت میں وِیوک وردھنی تھیٹر کے میدان میں منعقد ہوا۔ اس میں پنڈت درگنی نائک، سری کشن بیرسٹر، اصغر انصاری بیرسٹر رائے بشیشر ناتھ۔ پنڈت کیشو راؤ وکیل ہائیکورٹ کی تقریریں ہوئیں۔ اتفاق سے وہ راکھی پونم کا دن تھا۔ ہندوؤں نے صدر جلسہ کے ہاتھ پر راکھی باندھی۔ اتحاد و اتفاق سے رہنے کے عہد و پیماں ہوئے۔ نوجوانوں میں جذبۂ حریت ابھرا۔ یہ حالات حکومتِ وقت کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ چنانچہ فرمان مبارک کے ذریعہ خلافت کے جلسوں کی ممانعت کر دی گئی اس سے مسلم نوجوانوں کے جذبات

بھڑکے۔ بعض نے اعلحضرت کی خدمت میں سخت الفاظ برتتے ہوئے برقی تار روانہ کئے۔ اس گستاخانہ حرکت کی پاداش میں بعض نوجوانوں کو گرفتار کر کے منانور روانہ کیا گیا۔ بعض لوگ حیدرآباد سے باہر چلے گئے۔ اس کے بعد پھر حیدرآباد میں ہندو مسلم اتحاد کے ایسے پرجوش اور شاندار مظاہرے دیکھنے میں نہیں آئے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ راجہ بہادر نے ایک پُرجوش جلوس کو بغیر کسی گڑبڑ کے حکمت عملی سے ختم کرا دیا۔ اس زمانے میں گجرات کے دو مسلم لیڈر حیدرآباد آئے۔ خوب سنسنی پیدا کرتے ہوئے ایسا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ریذیڈنسی کے مجسٹریٹ کے اجلاس کی کھڑکیاں اور شیشے تک توڑ ڈالے اسی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ مجسٹریٹ کے اجلاس پر بیٹھ کر مصنوعی طور پر مقدمات کے فیصلے بھی سنا ڈالے۔ ریذیڈنسی کا علاقہ ریذیڈنٹ کے ماتحت تھا۔ ریذیڈنٹ نے سارے فرائض پولیس کے سپرد کر دیئے تھے۔ اس توڑ پھوڑ کے بعد وہ دونوں حضرات جلوس کی شکل میں نکلے اور حیدرآباد کا رخ کیا۔ راستے میں مختلف چوراہوں پر تقریریں کیں اور انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا اور نعرے لگائے اور خلافت کی تحریک کا پرچار کیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ جلوس بلدہ حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوا۔ راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی نے منٹ منٹ کی خبر رکھی تھی۔ آپ نے پولیس کو حکم دیا کہ نگرانی رکھی جائے اور گڑبڑ نہ ہونے دیں۔ ادھر آپ نے نائب کوتوال کو حکم دیا کہ چار پانچ سو پولیس کے جوانوں کو سادہ لباس میں جلوس میں شامل کر دیں جو جلوس کو لنگم پلی کی طرف بڑھا کر لے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس کے جوانوں کی غالب تعداد جلوسیوں کی طرح ان لیڈروں کے ساتھ ساتھ رہی اور عوام کی تعداد رفتہ رفتہ چھٹتی گئی۔ لنگم پلی پہونچتے پہونچتے لیڈروں کے ساتھ صرف پولیس کے جوان اور تھوڑے سے عوام رہ گئے۔ دونوں لیڈر پولیس کے گھیرے ہی میں تھے۔ راجہ بہادر بھی ٹھیک اس وقت اپنی موٹر میں سوار لنگم پلی پہونچ گئے اور ان کی موٹر کار اُن لیڈروں کے بازو جا کر ہی رکی۔ لیڈروں نے نعرے لگانے کی کوشش کی لیکن راجہ بہادر نے انھیں اپنی موٹر میں سوار کرا لیا۔ مختصر یہ کہ انھیں ایک رات پولیس کوارٹر میں رکھا گیا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہوتے

گجرات روانہ کر دیا گیا۔ اس جلوس کو منتشر کرنے اور لیڈروں کو قابو میں لا کر ریاست سے باہر کرنے کے لئے نہ تو پولیس کو طاقت کا استعمال کرنا پڑا نہ لاٹھی چارج کی نوبت آئی۔ نہ اشک آور گیس استعمال کرنے کی اور نہ کسی قسم کی تلخی پیدا ہوئی۔ اگر ایسی کارروائی کی جاتی تو بہت ممکن تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی، جلوسیوں اور پولیس میں تصادم ہو جاتا اور نتائج اچھے نہ ہوتے۔ راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی کی حکمت عملی نے سارے معاملے کو خوش اسلوبی کے ساتھ رفع دفع کرا دیا۔

راجہ بہادر کے حسن انتظام کی چند مثالیں آپنے ملاحظہ فرمائیں۔ اب دیوانی اور فوجداری معاملات میں بھی راجہ بہادر کے چند فیصلے ملاحظہ کیجئے۔ وہ اس کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے کہ ان کے آگے جو معاملہ پیش ہوا ہے وہ پولیس کے فرائض سے تعلق بھی رکھتا ہے یا نہیں مثلاً شوہر اور بیوی کے گھریلو جھگڑے، معمولی لین دین کی تکرار، اخلاقی بے راہ روی کے واقعات قمار بازوں کی گرفتاری، بھائیوں میں خاندانی تقسیم ان تمام معمولی اور بازاری قسم کے جھگڑوں کے علاوہ بڑے بڑے خاندانوں کی تقسیم جائیداد کے معاملات میں بھی آپ کو ثالث بنایا جاتا تھا۔ آپ ایسے خوشگوار سمجھوتے کرا دیتے کہ فریقین کو عدالت میں جانے اور زیر بار ہونے کی نوبت نہ آتی اور آپسی جھگڑوں کی وجہ سے بڑے گھرانوں کا خاندانی وقار متاثر ہونے سے بچ جاتا۔

راجہ بہادر کا اجلاس قدیم زمانے کے چودھریوں کی پنچایت کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اجلاس کا کمرہ دادخواہوں کے ہجوم سے کھچا کھچ بھرا رہتا۔ ایک طرف صدر امنا' اپنی رپورٹیں سناتے رہتے۔ دو اہلکار پیشی سامنے بیٹھے ہوئے ہوتے۔ ہر درخواست کو پڑھ کر اہلکاروں سے اپنی تجویز لکھا دیتے۔ حافظ کا یہ عالم کہ صدر امنا کی رپورٹ سنتے سنتے درمیان میں ٹوک دیتے اور فوراً بتا دیتے کہ فلاں فلاں امور رپورٹ میں تشنہ رہ گئے ہیں۔ ان کی تکمیل کے بعد مکرر پیش ہو۔ تجاویز لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور ساتھ ہی ساتھ مراسلوں اور دوسرے کاغذات پر دستخط بھی کرتے جاتے۔ امین صاحب کی رپورٹ کو پڑھتے ہوئے ملزمین پر کچھ ایسی نظر ڈالتے کہ رعب اور ہیبت سے ان کی روح پرواز کر جانے کے قریب معلوم ہوتی

مقدمہ کی نوعیت کے لحاظ سے پولیس والوں کی روایتی زبان میں الف سے ی تک ملزم کو صلوتیں سناتے۔ راقم الحروف کو کئی دفعہ راجہ بہادر کے اجلاس کے اوقات ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور انھیں ایسے بعض مقدمات کے تصفیہ کرتے ہوئے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک مقدمہ میں سلطان بازار سمت کے صدر امین نے ایک دیہاتی لڑکی، اس کے شوہر اور ایک تیسرے شخص کے متعلق رپورٹ پیش کی۔ یہ تیسرا شخص ایک نوجوان لڑکا تھا جس نے اس لڑکی کے ساتھ آشنائی پیدا کرلی تھی۔ لڑکی کے شوہر نے شکایت کی کہ فلاں لڑکا اس کی بیوی کو روزانہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور جب وہ اپنی بیوی کو گاؤں واپس لے جانا چاہتا ہے تو وہ نوجوان لڑکا اسے مارپیٹ شروع کرتا ہے۔ پولیس کی دریافت میں واقعہ صحیح پایا گیا اور اس دن تینوں کو کوتوال صاحب کے اجلاس پہ لائے گئے تھے۔ راجہ بہادر نے صدر امین سے کہا اس لونڈے سے پوچھو کہ کیا اس کی شادی ہوچکی ہے؟ معلوم ہوا کہ وہ بھی شادی شدہ ہے۔ فوراً امین صاحب کو حکم ہوا کہ اس لونڈے سے ایک اقرارنامہ داخل کرالو اگر آج سے پھر اس نے اس "لونڈی" کے مکان کا رخ کیا تو اس لونڈے کی "جورو" کو اس گاؤں والے کے حوالے کردو اور اس "لونڈی" کو اس "بدمعاش" کے حوالے کردو۔ اس کے بعد تلگو زبان میں اس لڑکے کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نوجوان نے پھر کبھی اس لڑکی کے مکان کا رُخ نہیں کیا۔ اس قسم کے فیصلے راجہ بہادر کے پاس روزانہ ہی ہوا کرتے تھے۔ غالباً قدیم زمانے میں چودھریوں کی پنچایتوں کا بھی یہی طرز ہوا کرتا تھا۔

راجہ بہادر کی کوتوال کے زمانے میں دیوانی اور فوجداری کے مقدمات میں نمایاں طور پر کمی ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ محکمۂ عدالت نے حکومت کو توجہ دلائی کہ کوتوال شہر کے فیصلوں سے جوڈیشنل ڈپارٹمنٹ کا احترام متاثر ہوتا نظر آرہا ہے اور اس سے عدالتی آمدنی میں بھی کمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ دیوانی اور فوجداری دونوں نوعیت کے معاملات کا کوتوال صاحب خود تصفیہ کردیتے تھے۔ غرض راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی کی کوتوالی شاندار اور کامیاب رہی۔

۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء

پروفیسر سید محمد

راجہ پرتاب گیرجی

راجہ پرتاب گیرجی، ہماری پرانی حیدرآبادی تہذیب کی آخری نشانی تھے۔ ان کی وفات سے اس دور کے تقریباً تمام باقیات اُٹھ گئے۔ اخلاق و مروت، دوستی اور محبت انسانیت و شرافت، علم دوستی اور فن پروری کے لحاظ سے اس دورِ قحط الرجال میں ان کا دم غنیمت تھا۔ وہ جس مجلس میں تشریف لاتے' لوگ ان کو بڑی عقیدت اور عزت سے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ان کا اندازِ گفتگو بڑا نرم اور لطیف ہوتا تھا۔ چاہے وہ نمائش کلب کی تفریح گاہ ہو یا اُردو مجلس کی علمی صحبت' لوگ ان کی موجودگی کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا تعلق حیدرآباد کے گوسائیں خاندان سے تھا جو بیک وقت بہت بڑا پیشوائے مذہب اور بے انتہا دولت مند خاندان تھا۔ اس خاندان کے ایک نامور فرد راجہ گیان گیرجی تھے جو نواب افضل الدولہ کے عہد میں تھے۔ انھیں بھی راجہ کا خطاب حاصل تھا اور وہ اپنے دور میں بہت بڑے اسٹیٹ کے مالک تھے۔ آغا پورہ میں راجہ دھن راج گیرجی کا محل گیان باغ انہی کے نام کی یادگار ہے ان کے چیلے راجہ نرسنگ گیرجی تھے جو عہد نواب میر محبوب علی خاں کے بہت بڑے ساہوکار اور گوسائیں تھے۔ سُنا ہے ان کی زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ وہ گیان باغ والے مکان میں رہتے تھے اور چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ رسوئی ان کے سامنے آٹا گوندھے، روٹی تیار کرے اور ساگ بنائے۔ وہ روزانہ دس گیارہ بجے ایک گھنٹہ کا وقت اس میں صرف کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا سارا وقت کاروبار اور پھر

گیان دھیان میں صرف ہوتا تھا۔ حیدرآباد کے کئی بڑے امراء ان کے مقروض تھے۔ جاگیریں، بنگلے، کوٹھیاں، جواہرات ان کے پاس رہن تھے۔ وہ طبیعت کے بڑے نیک، رحم دل اور با اخلاق تھے۔ حیدرآباد کے خاص و عام میں ان کی خاص عزت تھی، حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں نے انھیں ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء اپنی سالگرہ کے موقع پر ان کی شائستہ پبلک خدمات اور ملک و مالک کے ساتھ وفاداری کے اعتراف میں راجہ بہادر کا خطاب، ایک ہزاری منصب اور پانچسو جوانوں کی پلٹن کا اعزاز عطا فرمایا تھا۔ راجہ نرسنگ گیرجی، راجہ گیان گیرجی کی ساری جائداد کے تنہا مالک تھے اور خود انھوں نے بھی اپنی کوشش سے اس دولت میں غیر معمولی اضافہ کیا تھا۔ راجہ نرسنگ گیرجی نے خاصی عمر پائی تھی، وہ ۱۹۲۳ء حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک فوت ہوئے۔ ان کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقوں میں ان کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔

راجہ پرتاب گیرجی انھیں کے فرزندِ لطفی اور چیلے تھے۔ ان کے دوسرے چیلے راجہ دھن راج گیرجی ہیں۔ پرتاب گیرجی کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے اچھے اچھے اساتذہ سے علم حاصل کیا تھا۔ فارسی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں پر اچھا عبور تھا۔ خاص طور پر فارسی اور اردو کا ادبی مذاق بہت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ان کو بچپن سے اسپورٹس اور شکار کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر شکار پر جایا کرتے تھے۔ بڑے نفیس ذوق کے آدمی تھے۔ ان کی عظیم الشان کوٹھی اور اس کے در و دیوار، ان کی بلند حوصلگی اور نفیس ذوق کی گواہی دیتے ہیں۔ کوٹھی میں سنگ مرمر کا جو زینہ مجسموں والا بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لئے اٹلی سے معمار بلوائے گئے تھے۔

راجہ نرسنگ گیرجی کے انتقال پر بلحاظ کلائیت یہی ان کے جانشین ہونے والے تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس کو پسند نہیں کیا اور شادی کرلی جو گوسائیں کے لئے ممنوع تھی۔ اس لحاظ سے ان کے دوسرے بھائی راجہ دھن راج گیرجی جانشین کئے گئے اور انھیں پچاس

ساٹھ لاکھ روپے اور بہت سی غیر منقولہ جائداد حصے میں ملی۔ وہ بچپن سے بہت فیاض واقع ہوئے تھے۔ بمبئی کی سب سے بڑے اعلیٰ درجہ کی بستی میں ان کی ایک عالی شان کوٹھی تھی جو تمام ساز و سامان زندگی سے آراستہ تھی۔ یہ کوٹھی گویا ایک گیسٹ ہاوز تھی جہاں ان کے احباب جب کبھی بمبئی جاتے رہا کرتے تھے۔ ان کے کھانے پینے سیر و تفریح وغیرہ کے سب انتظامات راجہ صاحب کی جانب سے کئے جاتے تھے۔ ان کے احباب کا دائرہ نہایت وسیع تھا اور ہر مذہب و ملت کے معززین اور شرفائ ان کے دوست تھے علاوہ معمولی دعوتوں اور تقریبوں کے یہاں دو سالانہ تقریبین بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ ایک ہولی کی دعوت اور دوسرے دیوالی کی دعوت۔ دیوالی کے موقع پر جب کہ ساری کوٹھی جگمگ کرتی رہتی، راجہ صاحب دیوالی کے مہمانوں کی ضیافت میں خاص اہتمام سے مصروف ہوتے۔ بڑے پیمانے پر دیوالی ڈنر ہوتا۔ رات بھر محفل رقص و سرود چلتی رہتی، تمام مہمان گانے سننے اور ناچ دیکھنے اور ہنسنے بولنے میں ساری رات گذار دیتے، صبح تمام حاضرین کے لئے ناشتے کا انتظام کیا جاتا۔ ناشتے میں نہاری بڑے اہتمام سے تیار کرائی جاتی، اس کے علاوہ مختلف اصحاب کے مذاق کے لحاظ سے کھچڑی، نہاری، بگھارا کھانا، پلاؤ، پراٹھے، چپاتی، شیرمال روغنی روٹی سب ہی کچھ ہوتا۔ سب لوگ ناشتے اور چائے کافی سے فراغت پاکر دن کے دس بجے گھروں کو واپس جاتے۔

راجہ صاحب بمبئی کے یوروپین کلب کے بھی خصوصی رکن تھے۔ اس کلب کا صدر نشین بمبئی کا گورنر ہوا کرتا تھا اور صرف اعلیٰ درجہ کے سیول اور ملٹری عہدہ داروں تک اس کی رکنیت محدود تھی لیکن راجہ صاحب کے خاص اعزاز کی وجہ سے انھیں اس کا رکن بنایا گیا تھا۔ کلب کے سلسلہ میں کرسمس اور ایسٹر وغیرہ کی تقاریب پر راجہ صاحب کی فیاضیاں ضرب المثل تھیں۔ کئی شعراء اور مصنفوں کی راجہ صاحب نے بڑی قدر دانی کی۔ ان کی بے حد فیاضیوں نے آخر کار ان کی مالی حالت کو بگاڑ دیا۔ کم و بیش پچاس برس بڑے عیش و فراوانی سے گذرے۔ آخری پچیس سال کا زمانہ ایک طرح سے تنگی ترشی کا دور تھا لیکن اس حالت میں بھی ان کی فیاضی اور دوست

نوازی یہ ابر جاری تھی۔ وہ بہت مقروض ہو گئے تھے مگر اپنی آن بان میں آخر وقت تک فرق آنے نہیں دیا۔ آخری دور میں وہ اگلی باتیں تو نہیں رہیں البتہ اس کے بجائے انھوں نے ایک فیملی سرکل کا طریقہ ضیافت شروع کیا۔ مہینے میں ایک بار قریبی دوست احباب مع اپنی بیوی بچوں کے کسی ایک دوست کے یہاں چائے پہ مدعو ہوتے اور تھوڑی دیر سب جمع ہو کر ہنستے بولتے، یہ دعوتیں بھی زیادہ تر انہی کے مکان پہ ہوا کرتی تھیں کیوں کہ اس سرکل کے بعض ارکان کے مکان اتنے بڑے نہیں تھے جہاں سب دوستوں کو مدعو کیا جاتا۔

ان کی عظیم الشان کوٹھی، شادی بیاہ کی تقاریب کے لئے ہر وقت کھلی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے جو بھی اس کی اجازت چاہتے، راجہ صاحب خوشی سے اس کی اجازت دیتے، لوگ آٹھ آٹھ روز تک اپنی تقاریب کے لئے بلا معاوضہ ان کی کوٹھی استعمال کیا کرتے تھے۔

آخری دور میں راجہ صاحب کی آمدنی بہت محدود ہو گئی تھی۔ ان کے اکثر بچپن کے دوست اور ساتھی بھی ایک ایک کر کے دنیا سے اُٹھ گئے۔ وہ اکیلے محبت شب کی ٹمٹماتی شمع کی طرح ہماری محفلوں کی رونق تھے۔ یہ شمع بھی بالآخر بجھ گئی۔ اب نہ وہ دورِ ہم نہ وہ زمانہ، صرف اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔

۱۳ر جنوری ۱۹۶۳ء

صالحہ عابد حسین

نواب مہدی نواز جنگ

[محترمہ صالحہ عابد حسین، ہندوستان کی ممتاز ادیبہ اور دانشور ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کی رفیقہ حیات نے نواب مہدی نواز جنگ مرحوم پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے یہ ظاہر کردیا ہے کہ مہدی نواز جنگ صرف حیدرآباد ہی تک شہرت نہیں رکھتے تھے بلکہ ملک کے تمام ادیب ان کا احترام کرتے تھے۔ زیر نظر مضمون، یاد اور احترام کا ایسا ہی ایک اہم خراج ہے]

کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال		گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں		تاج فغفور و تختِ خاقانی
بحرِ ہستی بجز سراب نہیں		چشمۂ زندگی میں آب نہیں

میرے مہدی بھائی ـــ ابھی کل کی بات ہے آپ نے اپنی اس بہن کو گلے سے لگا کر اور نہ ٹھیرنے کا شکوہ کر کے دوبارہ آنے کی دعوت دے کر رخصت کیا تھا۔ پچھلے نو سال میں دس گیارہ بار آپ کی مہمانی کا لطف اور شرف مجھے حاصل ہوا۔ ہر بار آپ جس گرم جوشی جس محبت، جس خلوص سے پذیرائی کرتے اور جس پیار سے رخصت فرماتے اس کا گہرا اثر دل دماغ پر رہتا تھا۔ تقریباً ہر بار آپ یہ کہتے تھے کہ بہن ابھی مت جاؤ۔ کچھ دن اور ٹھیر جاؤ۔ آپ کے پاس سے آنے کو جی کس کا چاہتا تھا مگر مجبوریاں، فرائض اور کام جدا ہونے پر مجبور کر دیتے اور ہر بار جلدی ہی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ہم آپ سے رخصت ہوتے۔ دوبارہ آ کر اس پیاری ہستی کی محبت کا فیض اٹھاتے۔ ان خوبصورت صحبتوں میں بیٹھنے، پھر لطف و مہربانی، قدر دانی اور حوصلہ افزائی (جو اس دور میں بالکل نایاب ہیں) کی گرمی سے دل کو ایک نئی طاقت اور مسرت

حاصل کرنے کی تمنا سال بھر تک چٹکیاں لیا کرتی اور پھر جیسے ہی آپ کا محبت بھرا بلاوا وصول ہوتا (اور کتنا اہتمام کرتے آپ اس میں کہ ایسے وقت بلائیں جب ہم لوگوں کے لئے آسانی سے آنا ممکن ہو۔ اور کتنی کوشش ہوتی کہ آپ کے پاس آکر زیادہ سے زیادہ تخلیقی کام اور جسمانی آرام اور سکون ہمیں مل سکے) ہم کبھی احمد آباد، کبھی آبو، کبھی حیدرآباد، سینکڑوں میل کا سفر کرکے آپ کے قدموں میں پہونچ جاتے اور ہر بار رخصت ہوتے تو ہماری جھولی میں انسانیت پہ ایمان، انسانیت کی عظمت اور محبت وخلوص کی دولت کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ اپنے خوبصورت، شاندار آرٹسٹک گھروں کو آپ نے ہمیشہ "آپ کا گھر" کہا۔ میرا ہی کیوں۔۔ آپ تو کہا کرتے تھے۔ (کتنی سچی بات تھی یہ) کہ یہ "فن کاروں اور ادیبوں کا اپنا گھر ہے" اور میرا خیال ہے کہ میری طرح سبھی کو پہلی ہی بار یہ گھر "اپنا گھر" محسوس ہوتا ہوگا۔ اسی سال پھر مہینہ بھر آپ کے جنت نشاں شہر میں اور اس میں سے دس گیارہ دن "جنت ارضی" آپ کے گھر میں گذارے، کتنے دکھی تھے آپ، اس بات سے کہ پورا وقت کبھی آپ کے ہاں نہ رہ سکی۔ آپ کے خوبصورت آرام دہ مہمان خانے میں ٹھیرانے پر آپ کو افسوس تھا کہ چند قدم دور کیوں ٹھیرایا۔ اس پر آپ کا یہ کہنا "بہن گھر میں ماشاءاللہ اور بہت سے آدمی ہیں۔ اسی لئے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے مگر مل جل کر گذارہ کرلیں گے۔ آپ دوپہر اور رات کو اندر آکر آرام کیا کریں۔ لاکھ کہنے پر بھی آپ کو اطمینان نہ ہوتا کہ میں واقعی آرام سے ہوں۔ ہائے، بار بار آپ کا کہنا "بہن ابھی نہ جاؤ" "مہینے کے آخر تک تو ٹھیر ہی جاؤ" اور میری معذرت ومجبوری کو سن کر آپ کا یہ کہنا "جی نہیں بھرا بہن"، رخصت کرتے وقت بھی آپ نے ہمیشہ سے زیادہ بھینچ کر گلے لگایا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ ہائے میں کیا جانتی تھی کہ یہ میری آپ سے آخری رخصتی ہے۔ رخصت میں نہیں ہو رہی، آپ ہو رہے ہیں۔ کم نصیب کیا جانتی تھی کہ آخری بار میرے مہدی بھائی مجھے روک رہے ہیں۔ اب یہ پیاری صورت یہ بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ، یہ ذہین چمکتی آنکھیں کبھی دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ کبھی نہیں۔

دل کو باتیں جو تیری یاد آئیں کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

ہائے مہدی بھائی، آپ آٹھ دن بعد ہی ہمیشہ کے لئے دُنیا سے منہ موڑلیں گے یہ کون جانتا تھا؟ آپ تو اس بار ہمیشہ سے زیادہ چاق و چوبند، خوش و خرم نظر آتے تھے۔ صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کام کرتے۔ جلسوں، فنکشنوں، شادیوں، تقریبوں میں شرکت لوگوں سے ملاقاتیں، دعوتیں، دن میں دس پندرہ بار سیڑھیوں پر آنے جانے والے کو رخصت کرنے کے لئے باہر تک آنا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ستر سالہ بوڑھا ہے؟ پچاس سال کے تندرست جوان آدمی کی طرح آپ زندگی کے مشغلوں اور لطف و مسرت کے ہنگاموں میں مصروف تھے! اپنے غموں کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے دوسروں کی خوشیوں میں خوش! مگر آہ!

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر — تو نے کی جس سے بے وفائی
خندۂ گل سے بے بہا تر ہے — شان ہو جس میں دلربائی کی

مہدی بھائی! اب کون شاعروں، ادیبوں، مصوروں، سنگیت کاروں کی میزبانی کریگا ان کا دل بڑھائے گا۔ ان کی چیز دیکھ اور سن کر تعریفوں کے پُل باندھے گا۔ کون ضرورت اور مصیبت میں انتہائی خاموشی اور رازداری سے ان کی مدد کرے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسا گہرا خلوص اور فن اور فن کاروں کو پرکھنے اور سمجھنے کی بے پایاں صلاحیت کہاں پائیں گے؟

محسنِ فن کہاں گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات
ہائے کس کو سنائیں شعر و ادب — کس سے دادِ سخن وری پائیں
لائیں گے پھر کہاں سے مہدی کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

ہاں، ہاں جانتی ہوں میرے اسی جنت نشاں ملک میں بڑے بڑے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ عالم، فاضل، قابل، سیاست داں، بڑے بڑے وزیر، امیر، گورنر، حاکم، خادم قوم عاشق وطن۔ بہت سوں کو دیکھا ہے، پرکھا ہے، جانا ہے۔ وہ سب کچھ سہی۔ مگر ان میں کوئی مہدی نواز جنگ نہ ملے گا ○

خاک کو آسماں سے کیا نسبت؟

آپ پہلے ریاست حیدر آباد میں، بڑے سے بڑے عہدہ پر فائز رہے لیکن آپ نے ہمیشہ اپنے کو ریاست اور پرجا کا خادم جانا۔ آپ نے اتنا دیا اپنی ریاست اور اپنے لوگوں کو کہ کئی نسلیں ان کاموں، ان خدمتوں، ان عنایتوں اور نعمتوں کو نہ بھول سکیں گی۔ جو صرف مہدی نواز جنگ کی بدولت انھیں ملی تھیں۔ آپ گجرات کے گورنر رہے۔ گورنری کا عہدہ جو گویا ایک ایسی چیز سمجھ لیا گیا ہے کہ جو کسی کام کا نہ رہے اسے اسی گدی پر بٹھا دیا جائے اور گنتی کے دو چار گورنروں کو چھوڑ کر حالت بھی یہی نظر آتی ہے لیکن، آپ نے قبائے راج پالی زیب تن کی تو ایسی راس آئی کہ دیکھنے والے پھڑک اٹھے۔ گجرات ریاست کے سر پر مہدی نواز جنگ کا تاج ایسا جگمگایا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ آپ چند مہینوں میں 'مہدی بابا' پکارے جانے لگے بڑے سے بڑے سرمایہ دار سے لے کر غریب سے غریب آدمی کے لئے راج بھون کا پھاٹک کھلا تھا۔ "آداب گورنری" کو توڑنے کی شاید آپ کے سوا کسی اور نے ہمت نہ کی ہوگی۔ بچے آپ جان دیتے، عورتیں آپ کو مہا انسان کی طرح سمجھتی، مرد عزت و احترام کے احساس سے جیسے دوہرے ہو جاتے۔ مہمان (جن میں غریب فن کاروں، بے حد معمولی حیثیت کے دوستوں، عزیزوں اور لاتعداد چاہنے والوں سے لے کر راشٹرپتی، وزیر اعظم، دوسری ریاستوں کے گورنر اور وزیر دوسرے ملکوں کے سربراہ ملکہ ایلزبتھ تک سبھی شامل تھے) آپ کی میزبانی اور محبت و توجہ پر حیرت کرتے، فخر کرتے، لطف اٹھاتے، آج گجرات میں کچھ کم ماتم نہ ہوگا کہ پانچ سال اس نے ایسے شفیق و محترم سرپرست کی محبت اور جذبہ کا لطف اٹھایا جس سے اور ریاستیں محروم ہیں۔ جانتی ہوں کہ ہم خاصے محسن فراموش ہیں۔ بہت جلدی اپنے خادموں اور محسنوں کو بھول جاتے ہیں مگر خدمت و احسان کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں جو مٹ نہیں سکتیں۔ کچھ ایسے کام جو دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کی محبت اور خدمت کی جڑیں لاکھوں دلوں میں پیوستہ ہیں (اور جب میں لاکھوں کہتی ہوں تو اس میں مبالغہ یا محاورہ نہیں حقیقت

کا اظہار ہے) آج حیدرآباد کو سخت نقصان پہونچا ہے۔

اس کے مرنے سے مرگیا یہ شہر خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

تبھی تو یہ حال ہے کہ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا بے گانہ اشک بار ہے آج

نہیں نہیں۔ بے گانہ تو کوئی تھا ہی نہیں۔ سبھی آپ کے تھے۔ سب کے آپ تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حالی کا یہ شعر آج آپ ہی کے لئے نہیں کہا گیا مہدی بھائی!

نازشِ خلق کا محل نہ رہا رحلتِ فخر روزگار ہے آج

بارِ احباب جو اٹھاتا تھا دوشِ احباب پہ سوار ہے آج

تھی ہر اک بات میں شکر جس کی اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکین ماتم یارِ غم گسار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں، دلِ ناشاد کس سے خالی ہوا یہ "حیدرآباد"

مہدی بھائی! آپ سے ملنے سے پہلے میں نوابوں اور خطاب یافتہ رئیسوں سے کتنی بدظن تھی خود آپ کے ہاں پہلے پہل گئی تو کتنی نروس اور پریشان تھی۔ بھلا ہم مزدوروں اور غریبوں کی ان نوابوں و جنگوں سے کیسے نبٹ سکے گی؟ لیکن آپ سے ملنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ ان میں مہدی نواز جنگ جیسی ہستیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ "طبی شرافت" خاندانی ریاست (ریاست سے میرا مطلب یہاں دولت و جاگیر نہیں) اور ذاتی صفات مل کر انسان کو کیا بنا سکتے ہیں۔ پرانے مخیر رئیسوں کی جو دوستی، دریا دلی، مہمان نوازی اور وضعداری اپنی پوری رعنائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ کس طرح ایک انسان میں مجسم ہو سکتی ہیں اس کا جلوہ آپ میں نظر آیا۔ پرانی تہذیبی روایات اور نئے کلچر اور نئے زمانے کی قدریں اگر سمودی جائیں تو مہدی نواز جنگ کی سی حسین اور من موہن تخلیق ہو سکتی ہے اگر آپ کو میں اتنی قریب سے نہ جانتی تو کبھی ایمان نہ لا سکتی تھی کہ تخیل یوں حقیقت بھی بن جایا کرتا ہے۔

کوئی ایسا نظر نہیں آتا وہ زمین اور وہ آسمان نہ رہا
خاکساروں سے خاکساری تھی سربلندوں سے انکسار بھی تھا

نذرِ سائل تھی جان تک تیری درخورِ ہمت اقتدار بھی تھا

جو وزیر رہا یا گورنر ہر حال میں تہی دست رہا۔ اپنے لئے مایہ دار رہا۔ دوسروں کے لئے جو ہمیشہ قرضدار رہا اس لئے کہ جو ہوتا وہ آتے ہی دوسروں کی ضرورتوں پر صرف ہوجاتا تھا مگر یہ پرانے رئیسوں کی سی بے حدابۃ، بے اصول خیرات ہوتی تھی نہ نئے سرمایہ داروں اور نو دولتیوں کی نمائشی داتی۔ یہ وہ سچی خیرات تھی جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے جس کی ہدایت ہر بڑے مذہب اور ہر مذہبی رہنما نے فرمائی ہے جس سے لینے والے کو اذیت نہیں ہوتی۔ ذلت نہیں ہوتی! وہ خیرات جو دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے جس میں صرف پیسے ہی سے مدد نہیں کی جاتی بلکہ حسب ضرورت اور حاجت ہاتھ پاؤں، زبان، قلم، پیسہ جس کو جس کی ضرورت ہو وہ ملتی تھی۔ آپ کے دل کے دروازوں کی طرح گھر کے دروازے ہمیشہ سائل کے لئے کھلے رہتے۔ ہائے، آپ تو سدھارتے ہوئے بھی اپنی سب سے بڑی دولت جس کے لئے شاعر نے کہا تھا ع وہ آنکھیں میری باقی ان کا ــــ

دان کر گئے اور اندھوں کو بینائی کی بے بہا دولت دے گئے! مہدی نواز جنگ کا جسم خاکی خاک ہوجائے مگر کیا ان کے دل اور روح کی طرح ان کی یہ آنکھیں بھی زندۂ جاوید نہیں ہوگئیں؟

جانتی ہوں آپ عام معنوں میں مذہبی آدمی نہ تھے۔ مذہب کے ظاہری رسموں و آداب کی پابندی ہی کو آپ ایمان نہ سمجھتے تھے۔ مذہبی دنیا کی تنگ نظری، تعصب، قدامت پرستی اور رسم پرستی نے آپ کو روایاتی مذہب سے بددل اور بدگمان کردیا تھا۔ لیکن میری طرح اور سب انصاف پسند لوگ بھی یہ جانتے اور مانتے ہیں مذہب کی سچی روح، اسلام کی اصلی تعلیم اور ایمان کی دولت

سے مالا مال تھے ۔ آپ ساری دنیا کے مذہبوں کی عزت کرنا اور سچے بڑے مذہبی رہنماؤں کا احترام کرنا جانتے تھے ۔ آپ کا عقیدہ یہ تھا کہ ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

انسانیت کا تصور حالی کی طرح آپ کا بھی یہی تھا

چیست انسانی طپیدن از غم ہمسایگان از سموم بحر در باغِ عدن پژمان شدن

ہائے ؎ ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
بے ریائی تھی زہد کے بدلے ، زہد اس کا اگر شعار

مہدی بھائی ! کتنی بے نیازی سے آپ اپنے ان ہزاروں چاہنے والوں سے منہ موڑ گئے ! کیا یہ سچ ہے کہ خدا کا پیار پھول کی طرح ہلکا ' اس علائق سے بے گانہ ہو کہ اس کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے آج آپ کا شہر آپ کے لئے تڑپ رہا ہے ۔ آپ کے دوستوں کی آنکھیں خون رو رہی ۔ آپ کی ذات اور صفات کتنے ہی دماغوں کو روشنی دے گی ۔ آپ کی یاد کتنے ہی دلوں میں محبت و یقین کی شمع بن کر دکمے گی ۔ آپ کی گہری محبت بے پایاں خلوص ' بے بناوٹ ' اپنائیت کی یاد آپ کے دوستوں اور چاہنے والوں کا عزیز سرمایہ ہوگا ۔

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے اس کو دل سے بھلائے گا اب کون؟

مگر مہدی بھائی ! میں اب کس سے ملنے آؤں گی ۔

تم سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے جلکے اب یاں سے آئے گا اب کون؟
مر گیا تشنہ مذاقِ ادب ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون!

رخصت اے محبوب دوست ' محترم بھائی ۔ الوداع اے عظیم انسان الوداع ! آج ہم تیری جدائی پہ رو رہے ہیں ۔ آنے والی نسلیں فخر کریں گی کہ تو ان میں سے ایک تھا کیونکہ تو سچے معنوں میں ؎

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

۱۷ر جولائی ۱۹۶۷ء

رائے جانکی پرشاد

بابائے اُردو

۱۶۔ اگسٹ کو میں نے اخبارات میں جب یہ اندوہناک خبر پڑھی کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق انتقال فرماگئے تو دل و دماغ پہ ایک سناٹا چھاگیا اور معاً مدتوں پہلے پڑھا ہوا کسی شاعر کا یہ شعر یاد گیا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ مولوی عبدالحق اردو کے دیوانے، عاشق اور فریفتہ تھے۔ ان کے دل و دماغ اور ان کے احساسات پر اردو اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اگر کوئی ان سے کراچی کے موسم کے بارے میں گفتگو کرتا اور کہتا کہ مولوی صاحب یہاں کا موسم آج کل خوشگوار نہیں ہے تو یقین مانئے کہ جواب میں مولوی صاحب یوں گویا ہوتے کہ بھئی موسم تو اُسی وقت خوشگوار ہوگا جب کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم ہوجائے اور پاکستان میں اُردو کی پوزیشن مضبوط ہو۔

میں نے مولوی صاحب کو حیدرآباد کے سررشتہ دارالترجمہ میں کام کرتے دیکھا ہے اور برسوں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں ان دنوں دارالترجمہ میں اصطلاحات کے تعلق سے روئیدادیں لکھا کرتا تھا CONCISE OXFORD DICTIONARY کے مرتب کرنے میں بھی میرا حقیر سا حصہ رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مولوی صاحب نوجوانوں

کی ہمیشہ بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اس تعلق سے وہ بڑے وسیع النظر اور کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ میں نے اردو سے مولوی صاحب کے والہانہ عشق کے اثر انگیز مناظر بھی بارہا دیکھے۔ وہ دیوانہ وار کام کیا کرتے تھے تھکن کا لفظ تو جیسے مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں شاید وہ جانتے ہی نہ تھے کہ تھکن کسے کہتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اُردو کے لئے عرق ریزی اور لگن کے ساتھ جان سوز محنت، ان میں نئی طاقت و توانائی پیدا کرتی تھی، عمر کا لحاظ کرتے وہ جیسے جیسے بوڑھے ہوتے جارہے تھے اردو کی خدمت کے لئے ان میں نوجوانوں کا سا جوش پیدا ہوتا جارہا تھا۔ اردو کی خدمت کا ان کے دل میں ولولہ تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو بقول سروجنی نائیڈو اردو کو ساری دنیا کی زبان بنا دیتے، اسی بات کو کو دیکھئے کہ اُردو کا پیام گھر گھر پہونچانے کا ان کے سر میں سودا سمایا تو ملک بھر کے دورے شروع کئے اور وہ بھی اس مستعدی اور تیز رفتاری کے ساتھ کہ منزلیں گرد کے مانند اُڑنے لگیں۔ اس جذبۂ بے اختیار شوق میں سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر پیرانہ سالی کے باوجود ان کے لئے جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوئے تو کتابوں کا جنگل کھڑا کر دیا۔ مقدمات لکھنے بیٹھے تو اتنے لکھے اور اس پایہ کے لکھے کہ بعض منچلوں نے انھیں مقدمہ باز کا نام دے دیا۔ مرقع نگاری کی طرف توجہ کی تو صریر قلم سے مسیحائی کا کام لیا اور کتنے ہی مرے ہوؤں کو نئی زندگی عطا کی۔ تنقید کی راہ پر گامزن ہوئے تو ایسے پھونک پھونک کر اور بچ بچ کر جیسے کوئی مینا بار دوش ہو اور اس خار زار کو اس حزم و احتیاط سے طے کیا کہ مدح و ذم کے کانٹوں سے اپنے دامن کو کبھی اُلجھنے نہیں دیا۔ اور اس راہ کے نازک مرحلوں سے بڑی آسانی و کامیابی سے گزر گئے۔ تنقید کے ان نازک مرحلوں میں یہ کامیابی، در اصل ان کی سنجیدگی، دیانت اور موضوع سے انصاف کرنے کی خصوصیات کا نتیجہ تھی، تحقیق کے رسیا ہوئے تو ہماری زبان و ادب کے سرمایہ میں اپنے اعلیٰ معیاری کام سے گراں بہا اضافہ کیا۔ غرض اپنی لائق قدر انشاء، تنقید، تحقیق اور فن تعلیم میں مہارت سے

مولوی صاحب نے زمین اور اُردو کو سچ مچ آسمان کر دیا اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو سعدی شیرازی کی زبان میں عرض کروں کہ عبدالحق کی نگہِ التفات سے "کلاہ گوشۂ اُردو بہ آفتاب رسید"۔

مولوی عبدالحق نے اپنی محبوبۂ دلنواز اُردو کے حضور میں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر دیا

ع وفا خطا تھی، خطا اس نے زندگی بھر کی

اُردو کی ترویج و اشاعت کے مقصد میں بڑی سے بڑی شخصیت بھی اگر کبھی رکاوٹ بن کر سامنے آئی تو انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا جسے زندگی کی پرواہ نہ ہو وہ کب کسی اور چیز کی پرواہ کرتا ہے۔

در اصل اُردو کے دوستوں کو مولوی صاحب نے ہمیشہ اپنا دوست سمجھا اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن۔

اُردو سے انھوں نے جو کچھ کمایا، اُسے اس کی دیوی کے چرنوں میں خوشی خوشی بھینٹ چڑھایا۔ لیکن عمر بھر کمانے کے باوجود خود مولوی صاحب کی گرہ میں کیا؟ ان کے حصے میں کیا آیا۔ سرسید اور مولانا حالیؔ کے جانشین کو کیا ملا۔ سرسید کے جانشین کو کیا ملا۔ سرسید کے جانشین کو، بجز گالیوں، نفرت، حقارت اور روحانی کوفت کے اور مل ہی کیا سکتا تھا؟ تنگ نظر، خود غرض اور اپاہج قوموں میں پیدا ہوئے سرسیدوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوا ہے مجھے اس منزل پہ GENIUS کے بارے میں JONATTAN SWIFT کا ایک قول یاد آتا ہے۔ SWIFT نے کہا تھا۔

WHEN A TRUE GENIUS APPEARS IN THE WORLD,
YOU MAY KNOW HIM BY THIS SIGN THAT THE
DUNCIS ARE ALL IN A CONFEDERACY AGAINST
HIM ......!

وہ تو یہ کہئے کہ اُردو ہی کی طرح مولوی عبدالحق بھی سخت جان تھے کہ ہزار تلخیوں اور ناخوشگواریوں کے باوجود (۹۱) سال تک زندہ رہے۔ اُردو نے بھی اپنی حفاظت کے لئے ایسا جانباز اور سخت جان سپاہی اپنی زندگی کے کسی دور میں کب پایا ہوگا۔ سخت افسوس ہے کہ (۹۱) سال تک زندہ رہنے کے باوجود بابائے اردو کے خلوص اور ان کے دل کی پوشیدہ بیتابی کو دنیا نے نہیں پہچانا۔

کم نظر بے تابی جانش ندید
آشکارش دید و پنہانش ندید

آخر وہ کب تک اور کہاں تک اپنے دل کی بات زمانے بھر کو سمجھاتے۔ بالآخر ۱۶ر اگسٹ کو انھوں نے چپ سادھ لی۔ آج عبدالحق خاموش ہیں۔ ان کی زبان بند ہے موت نے آج ان کی زبان پر مہر خموشی لگا دی، دیکھئے ان کا چہرہ کیسا پُر سکون ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں اب ہم نہیں بولیں گے۔ قیامت تک نہیں بولیں گے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے متلاطم سمندر نے یکلخت پہاڑ جیسا سکوت اختیار کر لیا ہو اچھا ہی ہوا عبدالحق خاموش ہو گئے۔ بہروں کی دنیا کو وہ کب تک اُردو کی بپتا سناتے۔ ایک سچے عاشق کی طرح شوق اور انہماک سے عبدالحق نے زندگی بھر اُردو کی خدمت اس لئے بھی کی کہ ان کا خیال تھا کہ اُردو کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔ اپنے اس خیال کا اظہار بابائے اردو نے اردو مجلس کے نام "یوم مولوی عبدالحق" کے سلسلہ میں اپنے ایک بصیرت افروز پیام میں کیا تھا۔ بابائے اُردو نے فرمایا تھا کہ "اُردو کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔ اس نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ روا داری اور ملنساری اس کی فطرت میں ہے، اس نے اس برِ اعظم کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کیا اور سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا۔ اس لئے اردو کو اور اس کی پیدا کردہ تہذیب کو بچانا اور ترقی دینا ہم سب کا

فرض ہے۔" دراصل خلوص و بے غرضی کے ساتھ کام کرنے والوں پر ظلم و ستم دُنیا میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ اپنوں ہی نے ہمیشہ حوصلہ شکن فضا پیدا کر کے ایسے مجنونوں کی راہ میں روڑے اٹکائے اور وہ ظلم ڈھائے کہ

رہا نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

حضرات! خدا کا شکر ہے کہ اُردو مجلس کو اس بات کا اعزاز حاصل ہوا کہ اس نے بابائے اُردو کی زندگی ہی میں ان کی شاندار ادبی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کیا اور ماہ مئی ۱۹۶۰ء میں یوم مولوی عبدالحق منایا، حیدرآباد کی اسی ادبی انجمن نے چند ماہ پیشتر اپنے سہ ماہی ترجمان مجلس کا مولوی عبدالحق نمبر بھی شائع کیا تھا جس پر خود بابائے اُردو نے اظہار خوشنودی فرمایا تھا اور جس کا ادبی حلقوں نے بڑا حوصلہ افزا خیر مقدم کیا۔ اور اب تک ہندوستان اور پاکستان کے (۱۱) بلند پایہ ادبی رسالوں نے اس خاص نمبر پر گراں قدر تبصرے شائع کئے ہیں۔ نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی جیسی ممتاز ادبی شخصیتوں نے بھی بابائے اُردو کے حضور میں اُردو مجلس کے اس نذرانۂ عقیدت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

بے شک بابائے اُردو دُنیا سے رخصت ہو گئے لیکن انھوں نے جو تحریک چلائی تھی اُردو کی تحریک — اُسے زندہ رکھنا چاہیئے کیونکہ "تحریکوں کی موت ہی دراصل قوم کی موت ہوتی ہے۔" اگر اُردو والوں میں صحیح احساس فرض اور جذبۂ عمل ہے تو یہ تحریک آئندہ بھی زندہ رہے گی بلکہ میرا خیال ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا جائے گا اس میں اور تقویت پیدا ہوگی۔ خدا کرے کہ ہمارا شعور بیدار ہو اور ہمارے دل میں اُردو کی پُر خلوص خدمت کا حقیقی جذبہ پیدا ہو۔

"پائندہ باد اُردو"

۲۷/ اگسٹ ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر ونشی دھر ودیالنکار

ڈاکٹر زورؔ

ڈاکٹر زورؔ کو پہلے پہل میں نے اورنگ آباد میں دیکھا۔ اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج جس کا نام اب گورنمنٹ کالج ہے۔ اس کی طرف سے مولانا الطاف حسین حالیؔ کا صد سالہ جشن منایا جارہا تھا۔ وہ اس جلسہ میں مولانا حالیؔ پر مقالہ پڑھنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ اس وقت چڑھتی جوانی میں تھے اور شاید کچھ مہینے پہلے ہی لندن سے واپس تشریف لائے تھے۔ ان کا تقرر بطور ریڈر اُردو کے شعبہ میں ہوا تھا۔ لیکن ان دنوں میں بھی ڈاکٹر زورؔ کا نام عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ان دنوں میرے کچھ مضامین انجمن ترقی اُردو کے رسالہ 'اُردو' میں شائع ہوئے تھے۔ ان کو ڈاکٹر زورؔ نے پڑھا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ جب پہلی دفعہ مجھ سے ملے تب کہنے لگے "اردو میں آپ کے مضامین پڑھ کر میں نے تو یہ اندازہ لگایا تھا کہ آپ بوڑھے ہوں گے لیکن ماشاء اللہ آپ تو بالکل نوجوان ہیں۔ یہ باتیں انھوں نے کچھ ایسی بے تکلفی سے کہی تھیں کہ جیسے میرا ان کا تعلق کئی برس پرانا ہو۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ کس طرح بے تکلفی سے پر تکلف رشتہ پیدا کر لیتے ہیں۔

چند سال کے بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں آ گیا۔ اس وقت تک انھوں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو قائم کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے ساتھ کچھ ایسے نوجوانوں کو اکٹھا کر لیا تھا جو ہر وقت ان کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ انھوں نے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی اسکیم بھی بنائی اور کام بھی شروع کیا۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں مجھے بھی سنسکرت اور ہندی کا کام دیا تھا۔ میں نے انھیں کچھ کام کر کے دیا تھا

جسے انھوں نے انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے مجھے کئی دفعہ دعوت دے کر اپنے دولت خانہ پر بُلایا بھی تھا۔ میں اسی بات کو محسوس بھی کرتا تھا کہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اُردو کی کوئی ایسی بڑی خدمت کر جائیں جس کی بناء پر ان کا نام ہمیشہ کے لئے یاد رکھا جائے۔ انسائیکلوپیڈیا کا کام بہت بڑا کام تھا۔ اس میں جہاں سیکڑوں عالموں کی ضرورت تھی وہاں کافی رقم کی بھی ضرورت تھی۔ یہ رقم کہاں سے آتی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام بہت دور آگے نہ بڑھ سکا۔

انھوں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے بہت سی اہم کتابیں شائع کیں۔ ان میں 'دکنی' کی پرانی کتابیں بھی ہیں۔ دکن کے ادب کو اور لوگوں نے بھی مرتّب اور شائع کیا ہے لیکن وہ اس لٹریچر کے ساتھ اپنا پن اور لگاؤ محسوس کرتے تھے۔ جب اس دکنی ادب کو ہندی رسم الخط میں مرتب کرنے کے لئے کمیٹیاں بنیں تو وہ بھی ان کے رکن تھے۔ انھوں نے اس کام میں بڑی دلچسپی لی اور ساری کتابوں کو ہندی رسم الخط میں مرتب کر کے شائع کرنے میں بڑی مدد دی۔ گو دکنی کی کئی کتابیں اُردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان کا زبان اور ادب کی حیثیت سے جتنا گہرا مطالعہ کیا جانا چاہیئے ویسا ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اب تک جو کچھ مطالعہ کیا گیا ہے وہ سرسری نظر سے ہوا ہے۔

انھوں نے ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے کا نام "سب رس" رکھا تھا۔ اس لئے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکنی ادب سے انھیں کتنی دلچسپی ہے۔ یہ سچ ہے کہ "سب رس" اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس رسالہ کو اس طرح شائع کیا جائے کہ وہ دنیائے ادب اردو میں پہلے سے زیادہ مقبول ہو اور وہ اردو کی ایسی یادگار بن سکے جیسے کہ "ماڈرن ریویو" راما نند چیٹو پادھیائے کی یادگار ہے۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ "سب رس" کو ناگری رسم الخط میں بھی شائع کیجئے۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہوں جو اونچے درجے کے ہونے کے علاوہ زبان کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ایسے سیدھے سادے ہوں کہ ان سے ہندی اور اُردو قریب آسکے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے سے قبل انھوں نے ایوانِ اردو اور مولانا آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے لئے انھوں نے زمین اپنے پاس سے دی تھی اور انھوں نے اس کی عمارت جس طرح بنوائی یہ ان ہی کا کام تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ وہ تحقیقاتی کام کرانا چاہتے تھے اور اردو کے ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مطالعہ کو بھی فروغ دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اُردو ہندی اور تلگو میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لئے اسکالرشپس بھی دیئے تھے ہندی میں تحقیقاتی کام کے لئے بھی انھوں نے ہندی کی کچھ پرانی کتابیں لندن کے میوزیم سے منگوائی تھیں۔ یہ کتابیں یوروپین پادریوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اور اس کے کچھ وقت بعد تک ہندی اور اردو نثر کی کس طرح نشو و نما اور ترقی ہوئی تھی۔ ان کتابوں کو دیکھنے سے بہت سی نئی باتوں کا پتہ لگتا تھا اگر وہ زندہ رہتے تو ممکن تھا کہ اپنے اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ کچھ ایسا ہی کام کرجاتے جس طرح پونا کے بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کیا گیا۔ انھوں نے ایوان اُردو میں اردو کی نئی پرانی کتابوں اور دیگر کئی چیزوں کا ذخیرہ اس طرح شوق سے اکٹھا کیا اسے دیکھتے ہی بنتا ہے۔ میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنھیں خود انھوں نے ایوانِ اُردو کی ایک ایک چیز کو پوری تفصیل سے سمجھاتے ہوئے دکھایا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے اُردو کے بہت سے عالم پیدا کئے۔ بہت سے شاعر پیدا کئے۔ بہت سے انشار پرداز پیدا کئے، بہت سے ادیب پیدا کئے لیکن عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر زورؔ جیسے اُردو کی خدمت کرنے والے بہت کم پیدا کئے۔ ان کے دل میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو کے لئے کچھ کر گذرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا جو ان کی زندگی میں آخر تک قائم رہا۔ وہ حیدرآباد میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ انھیں آرام کرنے کے لئے وقت میسّر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "کشمیر میں میرے پاس وقت ہی وقت ہے لیکن حیدرآباد آتے ہی میں کچھ ایسا مشغول ہوجاتا ہوں کہ مجھے وقت ہی نہیں ملتا۔" جو شخص اس طرح کی ادبی انجمنیں بناتا ہے اُسے اپنے سے زیادہ دوسروں کو اہمیت دینی پڑتی

ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ بن گئے تھے اور ظاہر ہے ایسے آدمی کے لئے وقت کہاں؟

انہیں اردو زبان سے محبت تھی لیکن یہ محبت ایسی نہیں تھی جس کی بناء پر وہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی اہمیت کو نظر انداز کردیتے۔ وہ ہندی زبان یا کسی اور دوسری زبان کو برا نہیں کہتے۔ جب وہ کچھ دنوں کے لئے شعبۂ اُردو کے صدر تھے تو انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے۔ اس وقت ہندی صرف اردو کے مضمون کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی۔ وہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ انٹرمیڈیٹ میں ہندی میں (۲۵) بی اے میں (۳۰) اور ایم اے میں (۱۰۰) نمبر رکھے گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اُردو کے بورڈ آف اسٹڈیز میں یہ مسئلہ اٹھایا کہ ہندی کے لئے اتنے نمبر دینے کی کیا ضرورت ہے، بہت بحث ہوئی۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ یہ اردو کا مضمون ہے ہمارے لئے ہندی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ انٹرمیڈیٹ میں ہندی کے لئے (۲۰)، بی اے میں (۲۵) اور ایم اے میں (۵۰) نمبر رکھے جائیں۔ جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں ڈاکٹر زورؔ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ پہلے ہی ہندی کو بہت کم نمبر دیئے گئے ہیں۔ اس میں مزید نمبر کیوں کم دیئے جارہے ہیں۔ میں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس طرح کی باتوں کا اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ انھوں نے مجھے جواب دیا کہ انھیں اس بات کا رنج ہے اور وہ اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ ایسا ہونے نہ پائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ڈاکٹر زورؔ نے اپنا زور لگا کر ہندی کے نمبروں میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔ ایسی اور بھی کئی مثالیں ہیں وہ اردو اور ہندی کے جھگڑے کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ میل ملاپ کے حامی تھے اور وہ کہا بھی کرتے تھے کہ ہمیں نہ تو جھگڑا کرنا چاہیئے اور نہ جھگڑے کی فضا کو پیدا کرنا چاہیئے جب ہم لوگوں نے ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی اسکیم تیار کی تو انہیں بھی اس کا رکن بنانے کا فیصلہ کیا ہم ان کے پاس گئے۔ اس ادارے کی رکنیت کے لئے ایک سو روپیہ دینا پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ خود اُردو کے لئے اتنے کام کررہے تھے پھر بھی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ اس انسٹی ٹیوٹ کے لئے کچھ دے سکیں۔ انھوں نے فوراً ایک سو ایک روپیہ

کا چک کاٹ کر دے دیا اور رکن بننا قبول کر لیا۔ ان کی زندگی کے آخری برسوں میں میرے اور ان کے تعلقات اور قریبی ہو گئے تھے۔ کئی بار وہ میرے مکان پر تشریف بھی لایا کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں کشمیر چلا آؤں اور ان کے ساتھ مل کر کام کروں میں نے ان کے ساتھ دہلی سے جموں اور جموں سے دہلی تک کا سفر کیا۔ دہلی سے پٹھان کوٹ تک تو پہلے درجہ کا سفر تھا لیکن پٹھان کوٹ سے جموں تک بس سے سفر کرنا پڑا۔ پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان پانچ گھنٹوں کے سفر میں اتنے زیادہ تھک گئے تھے کہ گورنمنٹ ہاؤس پہونچتے ہی بستر پر لیٹ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ حیدرآباد چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے۔ کہنے لگے "اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے کام سے استعفیٰ دے کر حیدرآباد چلا آؤں۔ کشمیر میں ان کا جسم تھا لیکن ان کا دل حیدرآباد ہی میں رہتا تھا۔ ۔ ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کشمیر سے استعفیٰ دے کر حیدرآباد آ جاتے۔

سفر کے دوران انھوں نے اپنی زندگی کے کتنے ہی اچھے اور برے واقعات سنائے انھوں نے اپنی کچھ نظمیں بھی سنائیں۔ گاڑی دہلی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کھیت کھلیان گزرتے جا رہے تھے لیکن ان کے حالات زندگی کے تبصرے ختم نہیں ہو رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ ان کا یہ آخری سفر ہے اور اس طرح کا موقعہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔

وہ آج زندگی کا سفر طے کر چکے ہیں۔ اُردو سے متعلقہ ان کی بہت سی اسکیمیں ادھوری رہ گئی ہیں۔ ہم لوگوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی ادھوری اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں ان کا جسم تو سری نگر کی خوبصورت گھاٹیوں میں دفن ہو چکا لیکن ان کا ایوان اردو آج بھی سر بلند کئے کھڑا ہے اور کھڑا رہے گا۔

۵ر جنوری ۱۹۶۴ء

سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست